www.cpsglobal.org
www.mwkhan.com

الرسالہ
Al-Risala

March-April 2025 • Rs. 40

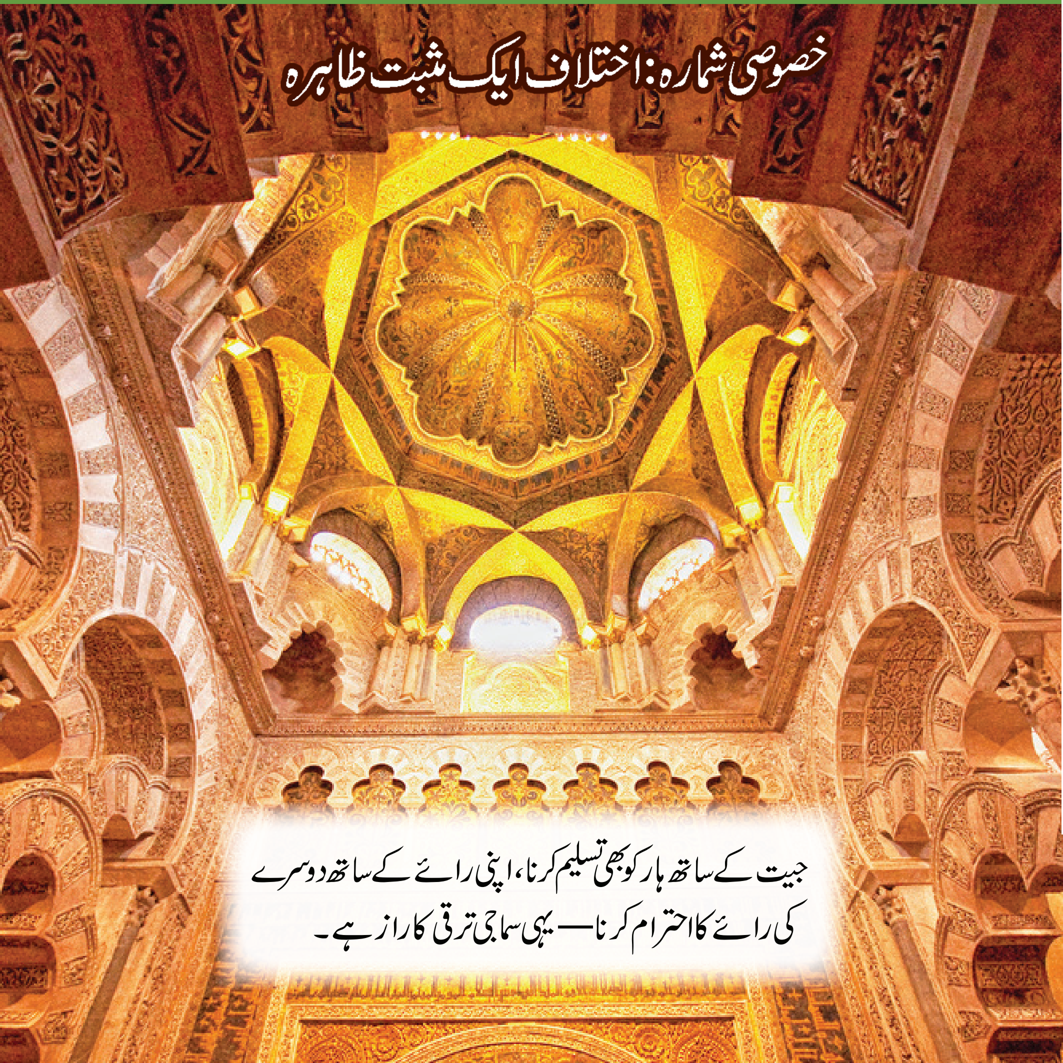

خصوصی شمارہ: اختلاف ایک مثبت ظاہرہ

جیت کے ساتھ ہار کو بھی تسلیم کرنا، اپنی رائے کے ساتھ دوسرے کی رائے کا احترام کرنا — یہی سماجی ترقی کا راز ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Mar-April 2025 | Volume 50 | Issue 2

Prof. Farida Khanam
Editor-in-Chief

Dr. Stuti Malhotra
Editor (Hindi Section)

Farhad Ahmad
Assistant Editor

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market
New Delhi 110013
Mobile: 8588822679, Tel. 0120 4314871
Email: info@goodwordbooks.com

Annual Subscription Rates

Retail Price	₹ 40 per copy
Subscription by Book Post	₹ 200 per year
Subscription by Regd. Post	₹ 400 per year
Subscription (Abroad)	US $20 per year

Bank Details
Saniyasnain Khan
State Bank of India
A/c No: 30087163574
IFSC Code: SBIN0009109

UPI UNIFIED PAYMENTS INTERFACE

To order books by
Maulana Wahiduddin Khan
please contact Goodword Books
Tel. 0120 4314871, Mobile: 8588822675
Email: sales@goodwordbooks.com

تحریر

مولانا وحیدالدّین خاں

فہرست

اختلاف، تنوع 4
اختلاف کا معاملہ 5
اختلافِ رائے 6
اختلاف ایک مثبت ظاہرہ 7
ترقی کا راز 8
فکری تعدّد، فکری حریت 10
مخاصمت نہیں 11
اختلاف اور اتحاد 12
اختلاف کو حل کرنے کی تدبیر 13
اختلاف، رواداری 18
رواداری کا اصول 19
آرٹ آف ڈفرینس مینجمنٹ 23
آرٹ آف لائف 24
شکایت ختم کرنے کا طریقہ 25
تخلیق میں تنوع 26
پختگی کیا ہے 27
اختلاف کے وقت 28
کامیابی کا راز 29
بلند فکری 30
امت میں اختلاف کا مسئلہ 31
تنقید واختلاف 32
اختلاف ایک فطری معاملہ 33
اختلاف کا مسئلہ 34
اختلاف ایک صحت مند ظاہرہ 36
اختلاف ایک برکت 37
فقہی مسائل میں اختلاف 38
اختلاف کے باوجود 42
اختلاف کے باوجود اعتراف 43
وسیع ترمفاد 44
تنقید کو سن کر 45
ذہنی ارتقا کا ذریعہ 46
اختلاف، نفرت 47
اختلاف کے ساتھ اعتراف 48
اختلاف کو بھلا دیا 49
اختلاف ایک آزمائش 50

विकास के तीन स्तर 1
सब कुछ ईश्वर का उपहार 5
जन्नत की क़ीमत 8
कुछ आदर्श महिलाएं 9
मौत: एक अनुस्मारक (Reminder) 14
शुक्र एक कुर्बानी का अमल 15

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of Al-Markazul Islami, New Delhi
Printed at Tara Art Printers Pvt. Ltd. A46-47, Sector 5, Noida-201301
Published from 1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013 Editor: Saniyasnain Khan

اختلاف، تنوع

قرآن کی ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے: إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّى (92:4)۔ یعنی، تمہاری کوششیں الگ الگ ہیں۔ کائنات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کے مختلف اجزاء میں بہت زیادہ تنوع (diversity) پایا جاتا ہے۔ اس کے باوجود کائنات میں کامل توافق (harmony) موجود ہے۔ اس اعتبار سے کائنات ایک ماڈل ہے کہ کس طرح یہ ممکن ہے کہ کامل اختلاف کے باوجود آپس میں کامل اتحاد پایا جائے۔

انسانوں کے درمیان بھی اسی طرح اختلاف یا تنوع موجود ہے۔ مگر یہاں عملاً برعکس صورت حال پائی جاتی ہے۔ انسانوں کے درمیان اختلاف کی بنیاد پر ٹکراؤ ہے۔ اس کے نتیجہ میں انسانی سماج میں نفرت اور تشدد، یہاں تک کہ جنگ کی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ کائنات کے دو حصوں میں یہ فرق کیوں۔ غیر انسانی حصۂ کائنات میں اختلاف کے باوجود اتحاد پایا جاتا ہے۔ جب کہ انسانی دنیا میں اختلاف لوگوں کے درمیان ٹکراؤ کا سبب بن جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسان اپنی خواہش پر چلتا ہے، کائنات کے ماڈل کو وہ نہیں اپناتا۔

کائنات کا ماڈل خالق کے تخلیقی منصوبہ پر مبنی ہے۔ خالق کی منشا کے مطابق مادی دنیا میں مختلف اجزاء کے متحد اور متوافق عمل سے اعلیٰ نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ماڈل گویا ایک مظاہرہ ہے، جو بتاتا ہے کہ انسان بھی اسی یونیورسل ماڈل کو اختیار کرے۔ فطرت کے ماڈل کو اختیار کرنے ہی میں انسان کی اعلیٰ ترقی کا راز چھپا ہوا ہے۔

خالق نے انسان کو تنوع کے اصول پر پیدا کیا ہے۔ ہر عورت اور ہر مرد کے اندر الگ الگ صفات (qualities) پائی جاتی ہیں۔ لوگوں کو چاہیے کہ وہ اس تنوع سے ٹکرانے کے بجائے اویل (avail) کرنے کا آرٹ سیکھیں۔ اس طرح انسان کے تمام معاملات اسی طرح درست طور پر قائم ہو جائیں گے، جیسا کہ کائنات کے بقیہ حصہ کے معاملات قائم ہیں۔ (سورۃ اللیل آیت 4 کا سبق)

اختلاف کا معاملہ

قرآن میں ایک حکم ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ (49:6)۔ یعنی اے ایمان والو، اگر کوئی فاسق تمھارے پاس خبر لائے تو تم اچھی طرح تحقیق کرلیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانی سے کوئی نقصان پہنچادو، پھر تم کو اپنے کیے پر پچھتانا پڑے۔

قرآن کی اس آیت میں اجتماعی زندگی کا ایک اصول بتایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ جب کوئی شخص کوئی اختلافی بات کہے تو سننے والے کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اس کو بدنیتی کا معاملہ سمجھ لے، اور کہنے والے کو برا آدمی سمجھنے لگے۔ اس کے بجائے صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس طرح کے معاملے کو تحقیق کا معاملہ سمجھا جائے، نہ کہ کسی شخص کے بارے میں رائے قائم کرنے کا معاملہ۔ کسی کے بارے میں رائے قائم کرنا صرف اتمام حجت کے بعد جائز ہے، اس سے پہلے نہیں۔

اصل یہ ہے کہ شکایت یا اختلاف کا سبب اکثر حالات میں بے خبری اور غلط فہمی ہوتا ہے۔ پیش آنے والے معاملہ کے بارے میں صحیح معلومات نہ ہونے کی بنا پر لوگ مخالفانہ رائے قائم کرلیتے ہیں۔ کسی کے بارے میں اس طرح رائے قائم کرنا درست نہیں۔ اسلامی تعلیم کے مطابق، اتمام حجت سے پہلے تحقیق ہے، اور اتمام حجت کے بعد رائے قائم کرنا۔

اجتماعی زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف شکایت ہوجاتی ہے۔ یہ شکایت بڑھتے بڑھتے نفرت بن جاتی ہے، اور نفرت کے بعد مزید برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک دوسرے کو بدنام کرنا، ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشی کرنا، ایک دوسرے کو اپنا دشمن سمجھ لینا۔ اس قسم کی اجتماعی خرابیوں کا سبب ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ لوگ تحقیق کے بغیر رائے قائم کرلیتے ہیں، وہ جو کچھ سنتے ہیں، اس کو درست سمجھ لیتے ہیں۔ اس طریقے کا نتیجہ بے حد سنگین ہے — دنیا میں ندامت اور آخرت میں مواخذہ۔

اختلافِ رائے

ایک بار میری ملاقات ایک مغربی اسکالر سے ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ اہلِ مغرب کی ترقی کا راز کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا — اختلافِ رائے (dissent) کو انسان کا مقدس حق قرار دینا۔ یہ بلاشبہ ایک درست بات ہے۔ لیکن وہ مغربی فکر کی بات نہیں، وہ فطرت کا ایک قانون ہے۔ اِس قانون کو ایک حدیث میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: اخْتِلَافُ أُمَّتِي رَحْمَةٌ (کنز العمال، حدیث نمبر 28686)۔ یعنی میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔

اختلاف رائے کا اظہار ہمیشہ تنقید (criticism) کی صورت میں ہوتا ہے۔ مگر تنقید خواہ وہ کسی شخص کے حوالے سے کی گئی ہو، وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے مطالعے کی ایک صورت ہوتی ہے۔ تنقید کا اصل مقصد کسی موضوع پر کھلے تبادلۂ خیال (open discussion) کا آغاز کرنا ہوتا ہے۔ تنقید کا مقصد یہ ہے کہ مختلف ذہن (mind) دیانت دارانہ طور پر (honestly) اپنے نتیجۂ تحقیق کو بتائیں، اور پھر دوسرے لوگ دیانت داری کے ساتھ اُس پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ اِس طرح کا آزادانہ تبادلۂ خیال ذہنی ارتقا (intellectual development) کا لازمی تقاضا ہے۔

علم اپنی نوعیت کے اعتبار ایک لامحدود موضوع ہے۔ یہ بات مذہبی موضوع پر بھی اُسی طرح صادق آتی ہے، جس طرح سیکولر موضوع پر۔ اختلافِ رائے بلاشبہ ایک رحمت ہے۔ اختلاف رائے ہر حال میں مفید ہے۔ اِس معاملے میں اگر کوئی شرط ہے تو وہ صرف ایک ہے، وہ یہ کہ اختلاف کرنے والا مسلّم دلیل کی بنیاد پر اختلاف کرے، وہ الزام تراشی کا طریقہ اختیار نہ کرے۔

اختلافِ رائے کے فائدے بے شمار ہیں۔ اِس سے زیر بحث مسئلہ کے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ اِس سے تخلیقی فکر (creative thinking) میں اضافہ ہوتا ہے۔ اِس کے ذریعے لوگوں کو موقع ملتا ہے کہ وہ دوسرے کے نتیجۂ فکر سے فائدہ اٹھائیں۔ اِس سے مسئلہ زیرِ بحث کے ایسے گوشے سامنے آتے ہیں جو پہلے سے ظاہر نہیں ہوتے، وغیرہ۔

اختلاف ایک مثبت ظاہرہ

ایک قول بطورحدیثِ رسول مختلف کتابوں میں نقل کیا گیا ہے۔اس کے الفاظ یہ ہیں: اخْتِلَافُ أُمتِي رَحْمَة (کنز العمال، حدیث نمبر 28686)۔یعنی میری امت کا اختلاف ایک رحمت ہے۔ محدثین عام طور پر اس قول کو بے اصل (لَا أَصلَ لَهُ) مانتے ہیں (المقاصد الحسنۃ، حدیث نمبر 39)۔ محدثانہ اصول کے مطابق یہ قول ایک بے اصل قول ہوسکتا ہے۔لیکن قانونِ فطرت کے اعتبار سے بلا شبہ وہ ایک درست قول ہے۔

اختلاف (difference) فطرت کے قانون کے مطابق ایک مثبت ظاہرہ ہے۔ وہ کوئی غیر مطلوب ظاہرہ نہیں۔اختلاف اگر سنجیدہ اختلاف ہوتو وہ ڈسکشن کا دروازہ کھولتا ہے۔لوگ اس پر سنجیدہ اظہارِ رائے کرتے ہیں،جس سے زیر بحث مسئلے کے نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔بیسویں صدی کے مشہور امریکی رائٹر اور صحافی والٹر لپ مین (Walter Lippmann,1889-1974) نے نہایت درست طور پر کہا ہے کہ جہاں تمام لوگ یکساں طور پر سوچیں، وہاں کوئی بھی زیادہ نہیں سوچتا:

Where all think alike, no one thinks very much.

جب دو پتھر آپس میں ٹکرائیں تو اس سے ایک تیسری چیز ایمرج کرتی ہے،اور وہ چنگاری ہے۔ یہی حال انسان کا ہے۔جب دو دماغ کسی اختلافی موضوع پر آپس میں گفتگو کریں تو اس سے ایک تیسرا خیال وجود میں آتا ہے، جو کہ دونوں کے ذہنی ارتقا (intellectual development) کا ذریعہ بنتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اختلاف ایک رحمت ہے۔اختلاف کو اگر سنجیدگی کے ساتھ لیا جائے تو اس سے غور وفکر کا نیا دروازہ کھلتا ہے، معاملے کے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔البتہ اس کی یہ شرط ہے کہ گفتگو کو ہار جیت کے معنی میں نہ لیا جائے، بلکہ موضوع کی تحقیق کے معنی میں لیا جائے۔بحث کے دونوں فریق اپنی ذات کو الگ کرکے زیرِ بحث مسئلے پر تبادلۂ خیال کریں۔

ترقی کا راز

مغرب کے سفر میں میری ملاقات ایک بڑے مغربی اسکالر سے ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ مغرب (West) کی ترقی کا راز کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا — اختلافِ رائے کو انسان کا ناقابل تنسیخ حق سمجھنا:

To accept dissent as an absolute human right.

مغربی اسکالر کے اس جواب کو سننے کے بعد میں نے اس موضوع کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس موضوع پر کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں، مثلاً:

1. *Dissent: The History of an American Idea* by Ralph Young, 2015, NYU Press
2. *On Liberty* by John Stuart Mill,1859
3. *The Constitution of Liberty* by F. A. Hayek,1960

اس موضوع پر اپنے مطالعے کے نتیجے میں مَیں اس رائے کی صداقت پر مطمئن ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مغربی تہذیب سے پہلے انسانی تاریخ میں اختلاف رائے کو انسانی حق (human right) کا درجہ حاصل نہ تھا۔ یہ صرف مغربی تہذیب کے بعد ہوا ہے کہ اختلاف رائے کو متفقہ طور پر ایک یونیورسل نارم کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔

اختلاف رائے کو ڈیسنٹ (dissent) کا نام دینا مغربی تہذیب کا ظاہرہ ہے۔ مغربی تہذیب سے پہلے یہ لفظ موجود نہ تھا۔ ڈیسنٹ ایک نیوٹرل لفظ ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ مثبت اختلاف کے لیے یہ ایک صحیح ترین لفظ ہے۔ مثبت اختلاف صرف اختلاف ہوتا ہے، وہ نہ موافق ہوتا ہے، اور نہ مخالف۔ میں سمجھتا ہوں کہ مثبت اختلاف اجتماعی ترقی کے لیے شرط لازم ہے۔

اختلاف اگر صرف اختلاف ہو تو وہ نہایت آسانی سے مخالفت کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اور مخالفت صرف ایک منفی سرگرمی ہے۔ مخالفت کو مثبت سرگرمی بنانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کو

مثبت معنی دے دیا جائے۔ یعنی اختلاف کو ڈیسنٹ (dissent) کا معنی قرار دینا۔ مثبت اختلاف طرفین کے لیے ذہنی ارتقا کا ذریعہ ہے، جب کہ منفی اختلاف کا دونوں میں سے کسی کے لیے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

میں ذاتی طور پر اختلاف رائے کو یہی درجہ دیتا ہوں۔ میں نے اپنے ذاتی تجربے سے یہ سمجھا ہے کہ اختلافِ رائے کو نہ ماننا خود اپنے ساتھ دشمنی کرنا ہے۔ اس لیے کہ اختلاف رائے کے ذریعہ زیرِ بحث مسئلے کے مختلف پہلو کھلتے ہیں۔ اس کے مختلف گوشے سامنے آتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اختلاف رائے کسی انسان کے لیے ذہنی ارتقا (intellectual development) کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ جو آدمی اختلاف رائے کو برداشت نہ کرے، وہ یقینی طور پر ایک بہت بڑی نعمت سے محروم ہوگیا، اور وہ نعمت ہے ذہنی ارتقا۔

کسی نے درست طور پر کہا ہے: مَن هُوَ نَاصِحُكَ خَيْرٌ لَكَ مِمَّنْ هُوَ مَادِحُكَ (جو شخص تمھیں نصیحت کرے، وہ اس سے بہتر ہے جو تمھاری تعریف کرے)۔ جو آدمی حقیقت پسند ہو، وہ یقیناً تنقید یا اختلاف رائے کو اپنے لیے ایک نعمت سمجھے گا۔ کیوں کہ تنقید اور اختلاف رائے ہمیشہ فکر کے نئے دروازے کھولنے والا ہے۔

تنقید یا اختلاف رائے کو کھلے ذہن کے ساتھ سننا میرے نزدیک کوئی تقویٰ کی بات نہیں ہے، بلکہ وہ خالص علمی بات ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی کے اندر سائنٹفک ٹمپر (scientific temper) موجود ہے۔ سائنٹفک ٹمپر اپنی اصل کے اعتبار سے یہ ہے کہ آدمی کے اندر اعترافِ حقیقت (acceptance of reality) کا مزاج ہو۔ جب آپ اپنا یہ حق سمجھتے ہیں کہ آپ آزادانہ طور پر سوچیں، اور آزادانہ رائے قائم کریں تو فطرت کے قانون کے مطابق آپ کو یہ بھی ماننا چاہیے کہ دوسرے شخص کو بھی یکساں طور پر اپنی رائے رکھنے اور اس کے اظہار کا حق حاصل ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اختلاف رائے کو کھلے ذہن کے ساتھ سننا، گویا حقیقتِ واقعہ کا اعتراف کرنا ہے۔ اسی اعتراف کا دوسرا نام سائنٹفک اسپرٹ ہے۔

فکری تعدّد، فکری حریت

اسلام میں فکری آزادی (intellectual freedom) کامل درجے میں پائی جاتی ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ فکری آزادی کے بغیر خدا کا تخلیقی منصوبہ (creation plan) پورا نہیں ہوسکتا۔ انسان کو موجودہ دنیا میں ابتلا (test) کے لیے رکھا گیا ہے اور یہ مقصد صرف اُسی وقت پورا ہوسکتا ہے جب کہ انسان کو اپنے قول وعمل کی پوری آزادی حاصل ہو۔

اسلام فکری آزادی کو پوری طرح تسلیم کرتا ہے، لیکن فکری تعدد (intellectual diversity) کا تصور اسلام میں نہیں۔ اسلام کے مطابق، ہر آدمی کو یہ حق ہے کہ وہ جس رائے کو چاہے، اختیار کرے۔ لیکن اِس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر رائے باعتبار حقیقت بھی درست ہے۔ اِس معاملے میں اسلامی تصور یہ ہے کہ باعتبارِ حقیقت تو صرف ایک ہی رائے درست ہے، لیکن باعتبارِ آزادی ہر انسان کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے لیے اِس دنیا میں جس رائے کو چاہے اختیار کرے۔

ابتلا کے سوا اِس اصول کی ایک اور اہمیت یہ ہے کہ فکری آزادی کے ماحول میں یہ ممکن ہوتا ہے کہ لوگوں کے درمیان آزادانہ ڈسکشن ہو اور آزادانہ ڈسکشن سے یہ فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ سماج کے اندر ذہنی ارتقا کا عمل (process) جاری رہے۔

فکری آزادی کا تصور انسان کی ذہنی ترقی کے لیے بے حد اہم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فکری آزادی کے بغیر ذہنی ترقی ممکن نہیں۔ کسی سماج میں فکری آزادی کو ممنوع (taboo) قرار دینا صرف اِس قیمت پر ہوتا ہے کہ وہ سماج فکری جمود (intellectual stagnation) کا شکار ہوجائے۔ لیکن فکری تعدد کے نظریے کو اگر اصولاً درست مان لیا جائے تو اس کے نتیجے میں جو چیز پیدا ہوگی، وہ فکری انتشار (intellectual anarchy) ہے، اور فکری انتشار ایک غیر صحت مند (unhealthy) حالت ہے، فکری انتشار کسی آدمی کو کنفیوژن (confusion) کے سوا کہیں اور نہیں پہنچاتا۔

مخاصمت نہیں

مخاصمت (opposition) اور اختلاف (difference) دونوں میں ایک چیز مشترک ہے، وہ یہ کہ دونوں کا آغاز ڈسپیوٹ (dispute) سے ہوتا ہے، لیکن عملی اعتبار سے دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ یہ فرق اتنا زیادہ ہے کہ اپنے نتیجے کے اعتبار سے، اختلاف پوری طرح ایک جائز فعل ہے اور مخاصمت پوری طرح ایک ناجائز فعل۔ درست اختلاف وہ ہے جو تمام تر علمی حقائق پر مبنی ہو، جس میں شروع سے آخر تک معلوم حقائق (objective facts) کی بنیاد پر گفتگو کی جائے۔

اِس کے برعکس، مخاصمت میں ساری بحث داخلی نیت پر حملہ اور الزام تراشی پر ہوتی ہے۔ اختلاف میں رایوں کا بدلنا ممکن ہوتا ہے۔ ایک فریق کی رائے اگر علمی تجزیے میں درست ثابت ہو تو دوسرا فریق کسی تاخیر کے بغیر اس کو تسلیم کرلیتا ہے۔

اختلاف کی حیثیت ایک علمی تبادلۂ خیال (scientific discussion) کی ہوتی ہے۔ اِس سے دونوں فریق کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، وہ دونوں فریق کے لیے ذہنی ارتقا کا ذریعہ بنتا ہے۔ اختلاف اپنی حقیقت کے اعتبار سے، بحث وتکرار کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ ایک اعلیٰ درجے کی علمی تلاش (scientific pursuit) کا نام ہے۔ اِس میں دونوں فریق ہار اور جیت کے تصور سے اوپر اٹھ کر مشترک طور پر امرِ حق کو دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اِس کے برعکس، مخاصمت ایک منفی سرگرمی کا نام ہے۔ مخاصمت ایک ایسا فعل ہے جو ہمیشہ علمی بددیانتی پر قائم ہوتا ہے۔ مخاصمت ایک ایسا فعل ہے جو غیر علمی بھی ہے اور غیر اخلاقی بھی۔ مخاصمت کا کوئی بھی مثبت فائدہ نہیں، نہ ایک فریق کے لیے، نہ دوسرے فریق کے لیے۔

مخاصمت یہ ہے کہ ایک شخص کو کسی سے دشمنی ہوجائے تو وہ اس کی توہین، اُس پر عیب زنی اور اس کے خلاف الزام تراشی میں لگا رہے — اختلاف رائے ایک ملکوتی فعل (البقرۃ، 2:30) ہے اور مخاصمت تمام تر ایک شیطانی فعل۔

اختلاف اور اتحاد

ہر ایک اتحاد چاہتا ہے، لیکن عملاً اتحاد قائم نہیں ہوتا۔ اِس کا سبب کیا ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ اتحاد کو قائم کرنے کے لیے جو تدبیر اختیار کی جاتی ہے، وہ غیر فطری ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اتحاد کے نام پر بڑے بڑے جلسے ہوتے ہیں، لیکن عملاً اتحاد قائم نہیں ہوتا۔

اتحاد کے علم برداروں کی مشترک غلطی یہ ہے کہ وہ اختلاف کو مٹا کر اتحاد قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ اختلاف (differences) کی موجودگی ہی اتحاد قائم نہ ہونے کا اصل سبب ہے۔ ہر ایک کی کوشش یہ ہے کہ اختلافات کو مٹا دیا جائے۔ اُن کا خیال ہے کہ حقیقی اتحاد اُسی وقت قائم ہوسکتا ہے، جب کہ لوگوں کے درمیان آپس کے اختلافات کا خاتمہ کردیا جائے۔ مگر اِس قسم کا اتحاد اِس عالم امتحان میں کبھی واقعہ بننے والا نہیں۔

اصل یہ ہے کہ اختلاف (differences) خود فطرت کا ایک لازمی حصہ ہیں، اور جو چیز فطرت کا حصہ ہو، اس کو ختم کرنا کبھی ممکن نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اتحاد قائم کرنے کا ایک ہی ممکن طریقہ ہے، اور وہ ہے— اختلاف کو برداشت کرنا۔ اِس دنیا میں جب بھی اتحاد قائم ہوگا، وہ اختلاف کے باوجود متحد ہونے سے قائم ہوگا۔ اختلاف کو مٹا کر اتحاد قائم کرنا اس دنیا میں عملاً ممکن ہی نہیں۔

خالق نے انسان کو اِس طرح پیدا کیا ہے کہ ان کے درمیان ہمیشہ اختلاف پایا جائے۔ یہ اختلاف انسان کے لیے ایک عظیم رحمت ہے۔ اختلاف کی بنا پر دو شخصوں یا دو گروہ کے درمیان ڈائیلاگ ہوتا ہے، اور ڈائیلاگ دونوں فریقوں کے لیے ذہنی ارتقا (intellectual development) کا ذریعہ بنتا ہے۔ اختلاف کی حیثیت ایک فکری چیلنج کی ہے۔

فکری چیلنج کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بند ذہن کے دروازے کھلتے ہیں، انسان کے اندر چھپے ہوئے امکانات ظاہر ہوتے ہیں، جو چیز بالقوہ (potential) طور پر ذہن میں موجود تھی، وہ بالفعل (actual) وقوع میں آجاتی ہے۔

اختلاف کو حل کرنے کی تدبیر

قدیم زمانہ میں کہا جاتا تھا کہ الحَرْبُ أنفَی لِلحَرْبِ (جنگ کا توڑ جنگ ہے)۔ یہ فکر ہزاروں برس سے انسان کے اندر چلا آرہا تھا۔ بدقسمتی سے یہی فکر تاریخی تسلسل کے نتیجہ میں خود مسلمانوں میں کسی نہ کسی طور پر جاری رہا۔ حضرت عثمان کی شہادت سے لے کر اب تک کی مسلم تاریخ میں اس کے نمونے پھیلے ہوئے ہیں۔ 1948 میں فلسطین کا مسئلہ پیدا ہوا، جو عملاً پوری مسلم دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ بن گیا۔ اس وقت بھی تمام مسلم ذہن اسی ڈھنگ پر سوچنے لگے۔ اس سوچ کی نمائندگی ایک عرب شاعر خیر الدین زرکلی (1976-1893) کے شعر میں ان الفاظ میں ملتی ہے:

هَاتِي صَلاَحَ الدِّينِ ثَانِيَةً فِينَا   وَجَدِّدِي حِطِّينَ أَوْ شِبْهَ حِطِّينَا

یعنی صلاح الدین ایوبی کو ایک بار پھر ہمارے درمیان لاؤ اور حطین یا اس جیسا کوئی اور معرکہ دوبارہ برپا کرو۔ اقبال اپنے علم اور ذہانت کے باوجود اس فکر سے اوپر نہ اُٹھ سکے۔ ان کا پورا کلام کسی نہ کسی طور پر اسی فکر کی نمائندگی کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کا یہ شعر پڑھیے:

گفتند جہان ما آیا بتومی سازد   گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

یعنی پوچھا گیا کہ میری دنیا کا نظام تمہیں پسند آیا؟ میں نے کہا: نہیں۔ کہا گیا: اسے درہم برہم کرڈالو۔ مگر اسلام نے اختلاف کے معاملہ میں زمانی رجحان کے برعکس فطری اصول رائج کیا۔ جنگ کیوں ہوتی ہے۔ جنگ ہمیشہ اختلافات کے نتیجہ میں ہوتی ہے۔ لوگ اختلاف کو صرف مٹانا جانتے تھے، اس لیے وہ فوراً فریقِ ثانی سے لڑ جاتے تھے۔ اسلام نے اس معاملہ میں ایک نئے اُصول کو رواج دیا۔ قرآن میں یہ اُصول ان الفاظ میں بتایا گیا ہے: الصُّلْحُ خَيْرٌ (4:128)۔ یعنی، صلح بہتر ہے۔

صلح کیا ہے۔ صلح یہ ہے کہ اختلاف کو مٹانے پر زور نہ دیا جائے بلکہ اختلاف کو گوارہ کرتے ہوئے تعلقات کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے (الصُّلْحُ يَختصُّ بِإِزَالَةِ النِّفارِ بَيْنَ النَّاسِ)

مفردات القرآن للاصفہانی، صفحہ 489۔ گویا اس کا مطلب ہے، اختلاف کے باوجود اتحاد۔ اس فارمولے کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

Art of difference management

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اسی تدبیر کا عملی نمونہ ہے۔ مثال کے طور پر آپ نے قدیم مکہ میں 610ء میں دعوتِ توحید کا مشن شروع کیا۔ اس وقت توحید کے نقطۂ نظر سے مکہ میں سب سے زیادہ سنگین مسئلہ یہ تھا کہ توحید کے گھر (کعبہ) میں 360 بت رکھے ہوئے تھے۔ مگر اس وقت قرآن میں اس مفہوم کی کوئی آیت نہیں اتری: طَهِّرِ الْكَعْبَةَ مِنَ الْأَصْنَامِ (کعبہ کو بتوں سے پاک کرو)۔ بلکہ اس کے بجائے قرآن میں یہ آیت اتری: وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (74:4)۔ یعنی، اپنے اخلاق کو درست کرو۔

اس قرآنی اُصول پر عمل کرتے ہوئے پیغمبر اسلام نے یہ کیا کہ آپ نے مکہ کے تیرہ سالہ قیام کے زمانہ میں کبھی بتوں کو توڑنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے بجائے آپ نے یہ کیا کہ لوگوں کو توحید کا پیغام دینے کی پرامن جدو جہد شروع کردی۔ پیغمبر اسلام کی زندگی میں اس قسم کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ ان میں ایک نمایاں مثال صلح حدیبیہ 628ء کا واقعہ ہے۔ یہ صلح گویا ڈیفرنس مینجمنٹ (difference management) کی ایک کامیاب مثال تھی جو انسانی تاریخ میں غالباً پہلی بار نہایت کامیابی کے ساتھ قائم کی گئی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو سخت انتباہ دیا تھا کہ اختلاف خواہ کتنا ہی بڑا ہو وہ ہر حال میں ڈیفرنس مینجمنٹ کے اُصول پر اس کو حل کرے۔ کسی بھی حال میں وہ ایسا نہ کرے کہ اتحاد کے نام پر اختلاف کو مٹانے کی کوشش کرے۔ حدیث کے مجموعوں میں کتاب الفتن کے تحت کثرت سے اس قسم کی روایتیں آئی ہیں جن میں یہ کہا گیا ہے کہ میرے بعد امراء اور حکام کے اندر بگاڑ آئے گا مگر تم ہرگز ان سے ٹکراؤ نہ کرنا۔ تم ظلم کے باوجود ان کا حق ادا کرنا اور اپنے حق کے لیے اللہ سے دعا کرنا (أَدُّوا إِلَيْهِمْ حَقَّهُمْ وَسَلُوا اللّٰهَ حَقَّكُمْ) صحیح البخاری، حدیث نمبر 7052۔

اس معاملہ میں ایک حدیث وہ ہے جو ابوداؤد، الترمذی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں آئی ہے۔ یہ

ایک لمبی روایت ہے، اس کا آخری حصہ یہ ہے: وَإِنِّي لَا أَخَافُ عَلَى أُمَّتِي إِلَّا الْأَئِمَّةَ الْمُضِلِّينَ، فَإِذَا وُضِعَ السَّيْفُ فِي أُمَّتِي لَمْ يُرْفَعْ عَنْهُمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ (مسند احمد، حدیث نمبر 17115)۔ یعنی مجھے اپنی امت کے بارے میں سب سے زیادہ اندیشہ گمراہ کن لیڈروں سے ہے اور جب تلوار میری امت میں داخل ہوگی تو پھر وہ اس سے قیامت تک نہیں اٹھائی جائے گی۔

اس حدیث کا مطلب دراصل یہ ہے کہ امت میں جب اختلافات پیدا ہوں گے تو نااہل لیڈر ڈیفرنس مینجمنٹ کے اُصول پر اس کو رفع نہ کرسکیں گے بلکہ وہ اختلاف کو دور کرنے کے نام پر لڑائی چھیڑ دیں گے اور جب ایک بار امت میں دین کے نام پر لڑائی کی روایت قائم ہوگئی تو اجتماعی نفسیات کی بنا پر وہ قیامت تک جاری رہے گی۔

حدیث کی یہ پیشین گوئی بدقسمتی سے امت کی بعد کی تاریخ کے بارے میں درست ثابت ہوئی۔ امت کے اندر وضعِ سیف (بذریعہ تلوار فیصلہ) کا طریقہ خلیفہ ثالث حضرت عثمان بن عفان کی شہادت کے ساتھ شروع ہوا۔ اس کے بعد وہ اس طرح مسلسل جاری ہوگیا کہ امت کی ہزار سالہ تاریخ میں وہ کبھی ختم نہیں ہو پایا۔ خلیفہ چہارم اور دمِ عثمان کے نام پر اُٹھنے والوں کے درمیان جنگ، حضرت حسین اور یزید کے درمیان جنگ، بنو امیہ اور بنو عباس کے درمیان جنگ، سنی اور شیعہ کے درمیان جنگ، مغلوں اور غیر مغلوں کے درمیان جنگ، اسی طرح موجودہ زمانہ میں سیکولر حکمرانوں اور اسلام پسند جماعتوں کے درمیان جنگ، وغیرہ سب اسی کی مثالیں ہیں۔

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اخْتِلَافُ أُمتِي رَحْمَة (المقاصد الحسنۃ للسخاوی، حدیث نمبر 39)۔ یعنی، میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اختلاف (difference) خدا کے تخلیقی نقشہ کا ایک حصہ ہے۔ وہ فطرت کا ایک لازمی جزء ہے اس لیے اختلاف کبھی زندگی سے ختم نہیں ہوتا۔ امت کے اصحابِ علم ومعرفت کو چاہیے کہ وہ اس راز کو سمجھیں اور اختلاف کو مٹانے کی کوشش کرنے کے بجائے اختلاف کے ساتھ جینے کا طریقہ اختیار کریں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ ڈیفرنس مینجمنٹ کے اصول پر اس مسئلہ کو حل کریں۔ اس

طرح سنت کی پیروی کی صورت میں اختلاف امت محمدی کے لیے رحمت بن جائے گا۔ اختلاف کے ہوتے ہوئے وہ ترقی کا پر امن سفر کامیابی کے ساتھ طے کرسکیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح دوسری بہت سی سنتیں ہیں اسی طرح وہ چیز بھی ایک سنت رسول ہے جس کو ہم نے آرٹ آف ڈیفرنس مینجمنٹ کا نام دیا ہے۔ اس اُصول کا تعلق اسلام کے تمام پہلوؤں سے ہے، کوئی بھی پہلو اس سے خالی نہیں۔

مثال کے طور پر فقہی اختلافات جو ہزار سال سے اب تک ٹکراؤ کا سبب بنے ہوئے ہیں ان کے معاملہ میں ڈیفرنس مینجمنٹ کا سادہ اُصول یہ ہے کہ یہ مان لیا جائے کہ یہ اختلافات توسع پر مبنی ہیں، نہ کہ تعدد پر۔ ان میں سے جس طریقہ کی بھی پیروی کی جائے وہ درست ہوگا (بِأَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمُ اهْتَدَيْتُمْ) جامع بیان العلم لابن عبدالبر، حدیث نمبر 1760۔

اسی طرح حضرت علی اور حضرت معاویہ کا معاملہ یا یہ سوال کہ چاروں خلفاء کے درمیان تفضیل کی بحث۔ اس قسم کے معاملات میں ڈیفرنس مینجمنٹ کے اُصول کا انطباق (application) یہ ہے کہ اس کو خدا کے حوالہ کردیا جائے اور ہر فرقہ اپنی آج کی تعمیری ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں مشغول ہوجائے۔

موجودہ زمانہ میں اکثر مسلم ملکوں میں سیکولر حکمرانوں اور اسلام پسند جماعتوں کے درمیان تباہ کن ٹکراؤ جاری ہے۔ اس معاملہ میں ڈیفرنس مینجمنٹ کا انطباق یہ ہے کہ اسلام پسند جماعتیں حکومت کے دائرہ میں براہ راست مداخلت کا طریقہ چھوڑ دیں۔ وہ غیر حکومتی دائرہ، مثلاً تعلیم اور اصلاح اور دعوت کے شعبوں میں اپنی کوششیں صرف کریں۔

موجودہ زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان لیڈر یا مسلم گروہ مختلف ملکوں میں کسی نہ کسی قومی یا ملّی مقصد کے حوالہ سے غیر مسلم حکومتوں سے متشددانہ ٹکراؤ کا سلسلہ جاری کیے ہوئے ہیں۔ مثلاً فلسطین اور کشمیر اور چیچنیا اور فلپائن، وغیرہ میں۔ ان مقامات پر ڈیفرنس مینجمنٹ کے اُصول کا انطباق یہ ہے کہ ہر قسم کے تشدد کو مکمل طور پر ترک کردیا جائے اور صرف مسلّمہ پر امن طریق کار کی پابندی کرتے ہوئے اپنی تحریک چلائی جائے۔

قرآن کی آیت: الصُّلۡحُ خَيۡرٌ (4:128) بتاتی ہے کہ ڈیفرنس مینجمنٹ کا مذکورہ طریقہ مطلق طور پر خیر کا سبب ہے۔ وہ ہر حال میں قابلِ عمل ہے۔ یہ طریقہ صرف اس وقت ناقابل عمل بن جاتا ہے جب کہ مسلمان تشدد کا آغاز کرکے فضا کو بگاڑ دیں۔ تشدد کا آغاز لازمی طور پر جوابی تشدد پیدا کرے گا اور پر امن طریق کار کو اختیار کرنا ممکن نہ رہے گا۔ اگر مسلمان یہ غلطی کریں کہ تشدد کا آغاز کرکے وہ صورت حال کو بگاڑ دیں تو خود انھیں کو دوبارہ صورت حال کو نارمل بنانے کی ذمہ داری لینی پڑے گی۔ اور وہ ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے تشدد کو یک طرفہ طور پر ختم کر دیں تاکہ وہ موافق فضا پیدا ہو جس میں ڈیفرنس مینجمنٹ پر عمل کرنا ممکن ہو جائے۔

اسلام دین فطرت ہے۔ مذکورہ اصول فطرت ہی کا ایک اصول ہے جس کو اسلام میں اختیار کیا گیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا کا نظام خدا نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں لازماً ایک اور دوسرے کے درمیان اختلافات پیدا ہوں۔ ایک اور دوسرے کے درمیان مختلف اعتبار سے اتنا زیادہ فرق پایا جاتا ہے کہ ہر انسان کو مسٹر ڈیفرنس کہنا صحیح ہوگا۔ اس دنیا میں ہر سماج فرق و اختلاف والا سماج ہے۔ یہ فرق و اختلاف چونکہ خود فطرت کا ایک لازمی حصہ ہے اس لیے اس کو ختم کرنا ممکن نہیں۔

ایسی حالت میں قابل عمل صورت صرف یہ ہے کہ فرق کے ساتھ نبھانے کا اصول اختیار کیا جائے نہ کہ فرق کو مٹانے کا۔

It requires difference management rather
than eliminating the difference.

فطرت کے اس اصول کا تعلق مذہبی معاملہ سے بھی ہے اور سیکولر معاملہ سے بھی۔ اس دنیا میں کوئی بھی نظام مذہبی ہو یا غیر مذہبی، کامیاب طور پر وہی لوگ بنا سکتے ہیں جو ڈیفرنس مینجمنٹ کا آرٹ جانتے ہوں۔ فرق و اختلاف کو مٹانا تشدد پیدا کرتا ہے اور فرق و اختلاف کو مینج کرنا امن اور ہم آہنگی کا سبب بنتا ہے۔

فرق و اختلاف کوئی بُرائی نہیں، وہ ترقی کا زینہ ہے۔ فرق و اختلاف سے اجتماعی زندگی میں چیلنج پیدا ہوتا ہے۔ اور چیلنج کا سامنا کرنا ہی اس دنیا میں ہر قسم کی ترقی کا واحد راز ہے۔

اختلاف، رواداری

رواداری (ٹالرنس) ایک اعلیٰ انسانی اور اسلامی صفت ہے۔ رواداری کا مطلب دوسروں کی رعایت کرنا ہے۔ اس کے مقابلہ میں عدم رواداری یہ ہے کہ آدمی صرف اپنے آپ کو جانے، وہ دوسروں کے تقاضے سے بے خبر ہو جائے۔ رواداری ایک اعلیٰ انسانی اسپرٹ ہے۔ اس کو شریعت میں مختلف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً— رفقِ، تالیفِ قلب، شفقت علی الخلق، وغیرہ۔

آدمی کے اندر جب خدا پرستی اور سچی دین داری آتی ہے تو وہ خود غرضی کے تحت پیش آنے والی تمام برائیوں سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ وہ اپنی ذات میں جینے کے بجائے حقائق میں جینے لگتا ہے۔ ایسا انسان عین اپنے مزاج کے مطابق دوسروں کو محبت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ وہ دوسروں سے کسی چیز کا امیدوار نہیں ہوتا اس لیے دوسرے اگر اس سے اختلاف رکھیں یا اس کے ساتھ اچھا سلوک نہ کریں تب بھی وہ دوسروں کا خیر خواہ بنا رہتا ہے۔ تب بھی وہ دوسروں کی رعایت کرتا ہے۔ تب بھی وہ دوسروں کے ساتھ اپنے روادارانہ سلوک کو باقی رکھتا ہے۔

رواداری یہ ہے کہ آدمی ہر حال میں دوسرے کی عزت کرے خواہ وہ اس کے موافق ہو یا اس کے خلاف۔ وہ ہر حالِ میں دوسرے کو اعلیٰ انسانی درجہ دے خواہ وہ اس کا اپنا ہو یا غیر۔ وہ دوسرے کے معاملہ کو ہر حال میں ہمدردی کا معاملہ سمجھے۔ خواہ دوسرے کی طرف سے بظاہر غیر ہمدردانہ سلوک کا اظہار کیوں نہ ہوا ہو۔

رواداری کا مطلب دراصل دوسروں کی رعایت کرنا ہے۔ اجتماعی زندگی میں لازمی طور پر ایک اور دوسرے کے درمیان اختلافات پیش آتے ہیں۔ مذہب، کلچر، رواج اور ذاتی ذوق کا فرق ہر سماج میں باقی رہتا ہے۔ ایسی حالت میں اعلیٰ انسانی طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے اصول پر قائم رہتے ہوئے دوسرے کے ساتھ رعایت اور توسع کا طریقہ اختیار کرے۔ وہ اپنی ذات کے معاملہ میں اصول پسند ہو مگر دوسرے کے معاملہ میں روادار۔ وہ اپنے آپ کو اپنے اصولوں کے معیار کی روشنی میں جانچے۔ مگر جب دوسروں کا معاملہ ہو تو وہ رواداری اور وسعتِ ظرفی کا طریقہ اختیار کرے۔ یہ رواداری انسانی شرافت کا لازمی تقاضا ہے۔ اسلام آدمی کے اندر یہی اعلیٰ شرافت پیدا کرتا ہے۔

رواداری کا اصول

جنوری 1995 کی پہلی تاریخ کو تمام اخباروں میں یہ خبر تھی کہ اقوام متحدہ نے 1995 کے سال کو رواداری کا سال (Year of Tolerance) قرار دینے کا اعلان کیا ہے۔ اقوام متحدہ کے ہیڈ کوارٹر نیویارک سے جاری ہونے والے اعلانیہ میں کہا گیا تھا کہ اپنے عمل، اپنے عقیدہ اور اپنی رائے میں رواداری ہونا وہ سب سے بڑا عامل ہے جس کے ذریعہ پرامن دنیا تعمیر کی جاسکتی ہے۔

موجودہ زمانہ میں جگہ جگہ نسلی ٹکراؤ، اقلیتوں کے خلاف امتیاز اور پناہ گزینوں کے خلاف نفرت کا اظہار ہو رہا ہے۔ اس کا واحد حل رواداری ہی ہے۔ نسل پرستی اور مذہبی انتہا پسندی بہت سے ملکوں میں امتیازی سلوک تک پہنچ گئی ہے۔ ان لوگوں کو ڈرایا دھمکایا جارہا ہے جو مختلف نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ اس طرح ان مصنفوں اور صحافیوں کے خلاف تشدد کے واقعات ہو رہے ہیں جو اظہارِ خیال کی آزادی کے حق کو استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

اکیسویں صدی کی آمد کے موقع پر یہ زبردست چیلنج ہمارے سامنے ہے اور اس کا واحد حل رواداری ہے۔ نارواداری صرف مسائل میں اضافہ کرتی ہے۔ وہ مسائل کو ختم نہیں کرتی۔ نارواداری اگر زیادہ بڑھ جائے تو وہ عالمی امن کے لیے ایک زبردست خطرہ بن جائے گی (ہندستان ٹائمس)۔

1995 As Year of Tolerance

The United Nations has proclaimed 1995 as the Year of Tolerance,saying the ability to be tolerant of the actions, beliefs and opinions of others is a major factor in promoting world peace. Amid the resurgence of ethnic conflicts, discrimination against minorities and xenophobia directed against refugees and asylum-seekers, tolerance is the only way forward, said the statement of the United Nations Educational, Scientific and Cultural Organisation (UNESCO). It said, racism and religious

fanaticism in many countries had led to many forms of discrimination and the intimidation of those who hold contrary views. Violence and intimidation against authors, journalists and others who exercise their freedom of expression, were also on the increase along with political movements which seek to make particular groups responsible for social ills such as crime and unemployment. Intolerance is one of the greatest challenges we face on the threshold to the 21st century, said the UNESCO statement. Intolerance is both an ethnic and a political problem. It is a rejection of the differences between individuals and between cultures. When intolerance becomes organised or institutionalised it destorys democratic principles and poses a threat to world peace. (*The Hindustan Times*, January 1, 1995)

اقوام متحدہ کا یہ اعلان نہایت صحیح اور بروقت ہے۔ آج دنیا کو سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہی رواداری یا ٹالرنس ہے۔

زندگی کی حقیقتوں میں سے ایک حقیقت یہ ہے کہ انسان اور انسان کے درمیان فرق ہوتا ہے۔ یہ فرق ہر سطح پر پایا جاتا ہے۔ خواہ کوئی خاندان ہو یا کوئی سماج ہو یا کوئی ملک ہو، ہر جگہ ایک اور دوسرے میں فرق اور اختلاف ضرور پایا جائے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس فرق اور اختلاف کی موجودگی میں اتحاد اور میل ملاپ کس طرح پیدا کیا جائے۔

کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ اتحاد کا ماحول اگر بنانا ہے تو اختلافات کو مٹا دینا ہوگا۔ مگر یہ رائے غلط ہے، کیوں کہ وہ قابل عمل نہیں۔ اگر آپ پھول کے ساتھ کانٹے کو پسند نہ کرتے ہوں تو آپ ایسا نہیں کر سکتے کہ کانٹوں کو توڑ کر کانٹوں کا خاتمہ کر دیں۔ کیوں کہ آپ ڈالی کا ایک کانٹا توڑیں گے تو اس کی جگہ دوسرا کانٹا نکل آئے گا۔ حتیٰ کہ اگر آپ تمام پھولوں پر بلڈوزر چلا دیں تب بھی جو نیا درخت اُگے گا اس میں دوبارہ پھول کے ساتھ کانٹے بھی ضرور موجود ہوں گے۔

اس دنیا میں کانٹوں کو گوارا کرکے ہی پھول کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اختلافات کو

برداشت کرکے ہی پرامن سماج بنایا جاسکتا ہے۔ اس دنیا میں اختلاف کے باوجود متحد ہونے سے اتحاد حاصل ہوتا ہے۔ نہ کہ اختلاف کو مٹا کر متحد ہونے سے۔ کیوں کہ اختلاف کو مٹانا سرے سے ممکن ہی نہیں۔ امن کی زندگی کو حاصل کرنے کا واحد راز ہے — بے امنی کو گوارا کرنا۔

دنیا میں فرق اور اختلاف ہونا کوئی برائی کی بات نہیں۔ یہ ایک مثبت خصوصیت ہے اور اس کے بہت سے بڑے بڑے فائدے ہیں۔ باغ حیات کی خوشنمائی کے لیے ضروری ہے کہ اس میں اتحاد کے پھول کے ساتھ اختلاف کا کانٹا بھی پایا جائے۔

اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ انسانوں میں اعلیٰ اخلاقیات کی تربیت ہوتی ہے۔ اپنے ہم خیال لوگوں کے درمیان اگر آپ خوش اخلاق ہوں تو آپ نے محض ابتدائی اخلاق کا ثبوت دیا۔ لیکن اگر آپ ان لوگوں کے درمیان خوش اخلاقی کا رویہ اختیار کریں جو آپ سے الگ خیال رکھتے ہیں یا آپ کے ناقد ہیں تو آپ نے یہ استحقاق حاصل کیا کہ آپ کو اعلیٰ اخلاقی سلوک کا کریڈٹ دیا جائے۔

اسی طرح اگر سماج میں تمام لوگ بالکل ایک رائے کے ہوں۔ ان میں کوئی اختلافی بحث نہ پیدا ہوتی ہو تو ایسا سماج پتھر کے اسٹیچو کا سماج بن جائے گا۔ اس کے درمیان رہنے والوں کی فکری ترقی رک جائے گی۔ فکری ترقی ہمیشہ افکار کے ٹکراؤ کے درمیان ہوتی ہے۔ پھر جہاں افکار کا ٹکراؤ ہی نہ ہو وہاں فکری ترقی کس طرح ہوسکتی ہے۔

نزاع اور اختلاف کے مقابلہ میں رواداری کا طریقہ اختیار کرنا کوئی انفعالی (passive) صفت نہیں۔ یہ عین ایجابی (positive) صفت ہے۔ زندگی کی تعمیر میں اختلافات کا نہایت اہم رول ہے۔ اختلافات کے عمل کے دوران ہی اعلیٰ انسانی شخصیت بن کر تیار ہوتی ہے۔ اگر انسانی سماج سے اختلاف کی حالت کو ختم کردیا جائے تو اس کے بعد اعلیٰ شخصیتوں کا بننا بھی یقینی طور پر رک جائے گا۔

اس دنیا میں کوئی بھی انسان کامل نہیں ہوتا۔ ہر آدمی کا یہ حال ہوتا ہے کہ اس میں ایک صفت ہوتی ہے تو دوسری صفت اس کے اندر نہیں ہوتی۔ یہ بھی ایک سبب ہے جس کی وجہ سے لوگوں کے درمیان فرق اور اختلاف پیدا ہوجاتا ہے۔

مگر اجتماعی زندگی کے لیے یہ اختلاف ایک رحمت ہے۔ کیوں کہ اسی اختلاف کی بنا پر یہ ممکن ہوتا ہے کہ ایک آدمی کی کمی کو دوسرا آدمی پورا کرے۔ ایک کی خصوصیت دوسرے کے کام آئے۔ اگر لوگوں کے اندر ایک دوسرے کے اختلاف کو گوارا کرنے کا مزاج ہو تو یہ اختلاف مجموعی انسانی ترقی کا ایک طاقتور وسیلہ بن جائے گا۔

1947 کے بعد جب انڈیا میں پہلی آزاد حکومت بنی تو اس میں دو اہم لیڈر شامل تھے۔ ایک پنڈت جواہر لال نہرو (وفات 1964)، دوسرے سردار ولبھ بھائی پٹیل (وفات 1950)۔ پنڈت نہرو کے اندر مغربیت تھی اور سردار پٹیل کے اندر مشرقیت۔ اس بنا پر دونوں لیڈروں میں اکثر رائے کا اختلاف ہو جاتا تھا۔ مگر یہ اختلاف قوم کے لیے نہایت مفید ثابت ہوا۔ کیوں کہ پنڈت نہرو کی صلاحیت سے سردار پٹیل کی کمی پوری ہوئی، اور سردار پٹیل کی صلاحیت پنڈت نہرو کی کمی کو پورا کرنے کا ذریعہ بن گئی۔

یہ ایک قریبی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رائے اور طبیعت کا اختلاف انسانیت کی عمومی ترقی کے لیے کتنا زیادہ ضروری ہے۔

رواداری کی خصلت آدمی کو اس سے بچاتی ہے کہ وہ اپنے وقت اور اپنی صلاحیت کو غیر ضروری چیز میں ضائع کرنے لگے۔ جب آپ کسی دوسرے کی خلافِ مزاج بات سے منفی اثر قبول کرلیں تو آپ کا ذہنی اعتدال بگڑ جائے گا۔ اس کے برعکس، جب اس طرح کی صورت پیش آنے پر آپ اس کا منفی اثر نہ لیں تو آپ کا ذہنی اعتدال پوری طرح برقرار رہے گا۔ آپ اپنا ایک لمحہ کھوئے بغیر ایک نارمل انسان کی طرح ہمیشہ اپنا کام جاری رکھیں گے۔ رواداری اور تحمل کی پالیسی آپ کی کارکردگی کی عمر کو بڑھاتی ہے اور نارواداری اور عدمِ تحمل کا رویہ آپ کی کارکردگی کی عمر کو گھٹا دیتا ہے۔

رواداری یا ٹالرنس کوئی مجبورانہ فعل نہیں، وہ زندگی کا ایک مثبت اصول ہے۔ یہ ایک اعلیٰ انسانی کردار ہے۔ کسی سماج میں روادار انسانوں کا ہونا ایسا ہی ہے جیسے کسی باغ میں پھولوں کا ہونا۔ پھول کے بغیر باغ نہیں، اسی طرح روادار انسانوں کے بغیر ترقی یافتہ سماج نہیں۔

(آل انڈیا ریڈیو ممبئی سے 3 مارچ 1995 کو نشر کیا گیا)

آرٹ آف ڈفرینس مینجمنٹ

طلاق کے بارے میں ایک حدیثِ رسول ان الفاظ میں آئی ہے: أَبْغَضُ الْحَلَالِ إِلَى اللّٰهِ تَعَالَى الطَّلَاقُ (سنن ابو داؤد، حدیث نمبر2178)۔ یعنی اللہ کے نزدیک حلال میں سب سے ناپسندیدہ عمل طلاق ہے۔ طلاق ایک ابغض (سب سے ناپسندیدہ) عمل کیوں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نکاح کا طریقہ اس لیے رکھا گیا تھا کہ انسان نکاح کے ذریعے اپنی تربیت کا کورس مکمل کرے۔ وہ کورس یہ ہے کہ موجودہ دنیا کے بارے میں خالق کا نقشۂ تخلیق یہ ہے کہ آدمی اس راز کو جانے کہ اختلاف کو مینج کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ زندگی میں لازمی طور پر اختلافات پیش آتے ہیں۔ یہ اختلافات اس لیے نہیں ہیں کہ آدمی لڑنا بھڑنا شروع کردے۔ بلکہ اس لیے ہیں کہ آدمی پر امن انداز میں ان کو مینج (manage) کرے۔

یہ اختلافات کسی کی سازش کی وجہ سے نہیں ہیں، بلکہ وہ نظامِ فطرت کا لازمی نتیجہ ہیں۔ ان اختلافات کے بارے میں یہ مطلوب نہیں ہے کہ آدمی ان سے لڑنا شروع کردے یا ان کو برائی (evil) سمجھ کر شادی کے بارے میں منفی رائے قائم کرلے۔ بلکہ آدمی کی ساری پلاننگ اس بنیاد پر ہونا چاہیے کہ جو شادی ہوگئی، اس کے ساتھ اس کو نباہ کرنا ہے۔ کوئی دوسرا آپشن اس کے لیے ممکن نہیں۔

شادی کا مقصد زندگی کی خوشی حاصل کرنا نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ زندگی کو سمجھ کر انسان مثبت انداز میں اس کی تعمیر کرے۔ ایسی تعمیر جو پوری انسانیت کے لیے مفید ہو۔ شادی دو انسانوں کے درمیان اجتماع کا نام نہیں ہے، بلکہ شادی ایک سماجی ذمے داری ہے۔ شادی سماج کے عمومی عمل کا ایک حصہ ہے۔ شادی مستقبل کی منصوبہ بندی ہے، نہ کہ وقتی طور پر خوشیوں کی ایک دنیا بنانا۔ خوشیوں کی دنیا بنانے کا نظریہ ایک ایسا نظریہ ہے، جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے:

Prima facie it stands rejected.

چنانچہ دنیا میں کوئی شادی اس معیار پر پوری نہیں اترتی۔ ہر شادی اس معیار پر قابلِ رد قرار پاتی ہے۔

آرٹ آف لائف

ایک فوجی جنرل نے بتایا کہ آرٹ آف وار (art of war) کیا ہے۔ اُس نے کہا کہ — سب سے زیادہ مؤثر مسلّح فوج وہ ہے جو غصہ اور نفرت کے بغیر لڑائی کرے:

The most effective armed forces are those who fight without anger or hate.

ایسا کیوں ہے کہ غصہ اور نفرت کے بغیر لڑی جانے والی جنگ زیادہ کامیاب جنگ ہوتی ہے۔ اُس کا سبب یہ ہے کہ جب فوج غصہ اور نفرت سے خالی ہوتو وہ زیادہ بہتر انداز میں مقابلے کی منصوبہ بندی کرسکتی ہے۔ غصہ اور نفرت، انسان کی عقل کو ماؤف کردیتے ہیں۔ ایسی حالت میں اُس کے لیے زیادہ بہتر تدبیر کار اختیار کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

یہ اصول صرف آرٹ آف وار کا اصول نہیں ہے، بلکہ وہ آرٹ آف لائف کا اصول بھی ہے۔ میدانِ جنگ سے باہر جو انسانی زندگی ہے، وہاں بھی مسلسل طور پر افراد اور گروہوں کے درمیان پُرامن مقابلہ جاری رہتا ہے۔ اِس پُرامن مقابلے میں ضرورت ہوتی ہے کہ فرد یا گروہ اپنے معاملے کی کامیاب منصوبہ بندی کریں۔ یہ کامیاب منصوبہ بندی دوبارہ وہی ذہن کرسکتا ہے جو غصہ اور نفرت سے خالی ہو، جو غیر متاثر ذہن کے تحت حالات کا اندازہ کرے، جو واقعات کا منفی اثر لیے بغیر اپنی تدبیر کا نقشہ بنائے۔ ایسا انسان معاملات کو بے لاگ انداز میں دیکھتا ہے، وہ خالص حقائق کی روشنی میں اپنے عمل کا نقشہ بناتا ہے۔ ایسے ہی لوگ اپنے حریف کی پوزیشن کا صحیح اندازہ کرتے ہیں۔ اور جو لوگ ایسا کریں، وہی کامیابی کی منزل تک پہنچتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آرٹ آف لائف کا اصول بھی وہی ہے جو آرٹ آف وار کا اصول ہے۔ دونوں ہی میں کامیابی وہ لوگ حاصل کرتے ہیں جو معاملات پر مثبت ذہن کے تحت غور کریں۔ اِس کے برعکس جو لوگ منفی ذہن کے تحت سوچیں، وہ ہمیشہ ناکام رہتے ہیں، حربی مقابلے کے میدان میں بھی اور پُرامن مقابلے کے میدان میں بھی۔

شکایت ختم کرنے کا طریقہ

سماجی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو دوسرے سے شکایت اور اختلاف پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ بات خاندان کے اندر بھی ہوتی ہے اور خاندان کے باہر بھی۔ جب ایسا ہوتا ہے تولوگ عام طور پر یہ کرتے ہیں کہ وہ اپنی صفائی پیش کرنے لگتے ہیں۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح وہ اپنے رویے کو درست ثابت کریں۔ شکایت اور اختلاف پیدا ہونے کے بعد ہر ایک ایسا ہی کرتا ہے۔ لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ اس طرح شکایتیں ختم نہیں ہوتیں۔ لوگ بظاہر چپ ہوجاتے ہیں لیکن جوشکایت تھی وہ بدستور دل میں باقی رہتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا سماج پورا کا پورا شکایت سے بھرا ہوا سماج بن گیا ہے۔ ہر ایک منفی نفسیات میں جیتا ہے۔ مثبت نفسیات میں جینے والا انسان کہیں نظر نہیں آتا۔

اس معاملے کا حل صرف یہ ہے کہ موجودہ طریقے کو ختم کردیا جائے۔ شکایت پیش آنے کی صورت میں اس کی صفائی کی کوشش نہ کی جائے، بلکہ سیدھے طور پر اپنی غلطی مان لی جائے۔ اپنے کو درست ثابت کرنے کے بجائے یہ کہہ دیا جائے کہ — میں غلطی پر تھا، مجھے معاف کردو۔ یہ طریقہ عظیم اخلاقی قدر (moral value) کا حامل ہے۔ اپنی غلطی نہ ماننا، ہمیشہ کبر کی بنا پر ہوتا ہے، لیکن بحث کے بغیر اپنی غلطی کو مان لینا، آدمی کے اندر وہ عظیم صفت پیدا کرتا ہے جس کو تواضع (modesty) کہا گیا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اختلافی معاملے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ معاملہ ذاتی شکایت کا معاملہ ہو۔ اور دوسرا یہ کہ وہ معاملہ علمی اور دینی معاملہ ہو۔ اگر معاملہ ذاتی شکایت کا ہوتو اس کو ختم کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ یہ نہ دیکھا جائے کہ حقیقی معنوں میں کس کی غلطی تھی، بلکہ تواضع کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے فوراً خود اپنے کو غلط مان لیا جائے۔ اِس طرح معاملہ فی الفور ختم ہوجائے گا۔ البتہ اگر معاملہ علمی یا دینی ہو، یعنی اس کا تعلق اصولی نوعیت کا ہوتو دلائل کے ذریعے اس کی وضاحت کی کوشش کرنا چاہیے۔ مگر یہاں بھی ضروری ہے کہ بات کو صرف دلائل تک محدود رکھا جائے، اُس کو ضد تک نہ پہنچنے دیا جائے۔ دلیل کے ذریعے جو بات ثابت ہوجائے اُس کو دونوں فریق مان لیں۔ اِس طرح نہ صرف یہ کہ معاملہ ختم ہوگا، بلکہ وہ دونوں کے لیے ذہنی اور روحانی ارتقا کا ذریعہ بن جائے گا۔

تخلیق میں تنوع

قرآن میں مختلف مقامات پر انسان کی تخلیق کا قصہ بیان ہوا ہے۔ ان میں سے ایک جزء کا ترجمہ یہ ہے— جب تمھارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں۔ پھر جب میں اس کو درست کرلوں اوراس میں اپنی روح پھونک دوں توتم اس کے آگے سجدے میں گر پڑنا۔ پس تمام فرشتوں نے سجدہ کیا۔مگر ابلیس کہ اس نے گھمنڈ کیااور وہ انکار کرنے والوں میں سے ہوگیا۔ اللہ نے فرمایا کہ اے ابلیس، کس چیز نے تجھ کوروک دیا کہ تو اس کوسجدہ کرے جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا۔ یہ تو نے تکبر کیایا تو بڑے درجہ والوں میں سے ہے۔اس نے کہا کہ میں آدم سے بہتر ہوں۔تو نے مجھ کوآگ سے پیدا کیا ہے، اوراس کومٹی سے۔(38:71-76)

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ابلیس نے اپنی افضلیت کا دعویٰ خوداپنی زبان سے کیا تھا۔اس کے برعکس، انسان کا معاملہ یہ ہے کہ اس کی افضلیت کا بیان خود خالق نے اپنی زبان سے کیا ہے۔ابلیس کی بات خود ساختہ دعویٰ کی ہے۔جب کہ انسان کی افضلیت کا اعلان خود خالق کائنات نے کیا ہے۔اللہ اور ابلیس کے درمیان اس مکالمے سے کئی باتیں سامنے آتی ہیں۔انھیں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اللہ کا جو منصوبہ ترقی کے بارے میں ہے، وہ اختلاف (diversity) سے تعلق رکھتا ہے، نہ کہ یکسانیت سے۔ جہاں یکسانیت ہوگی، وہاں ارتقا رک جائے گا، اور جہاں اختلاف پایا جائے، وہاں ارتقا جاری رہے گا۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کوتنوع پسند ہے۔اگر یکسانیت اللہ کا مطلوب ہوتا تو فرشتہ، جنات اور انسان سب کو اللہ یکساں بنا دیتا۔سب کی سوچ، سب کا ذوق، سب کا عمل، بالکل ایک طرح کا ہوجاتا۔مگر اس دنیا کے خالق کوتنوع پسند ہے، نہ کہ یکسانیت۔ یہ فطرت کا قانون ہے، اور فطرت کے قانون میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔اسی فطری حقیقت کو اردو کے مشہور شاعر ذوق نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینتِ چمن   اے ذوؔق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

پختگی کیا ہے

انسانوں میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں— ناپختہ ذہن والے، اور پختہ ذہن والے۔ ناپختہ ذہن وہ ہے جو جذباتی طور پر سوچے، جو رومانی خیالات میں جیے، جو اپنی خواہشات کی پیروی کرے، نہ کہ حقائقِ حیات کی۔ اِس کے مقابلے میں پختہ ذہن والا انسان وہ ہے جو اپنے جذبات سے اوپر اٹھ کر حقیقتوں کو سمجھے، جو اپنے ذہنی خول سے باہر آ کر چیزوں کو دیکھے اور حقیقت پسندانہ انداز میں اپنی رائے قائم کرے۔ پختگی (maturity) اِس صلاحیت کا نام ہے کہ آدمی اُن چیزوں کے ساتھ نارمل طریقے سے رہ سکے جن کو وہ بدل نہیں سکتا:

Maturity is the ability to live with things you cannot change.

ہر آدمی اپنی سوچ اور اپنے جذبات کے لحاظ سے ایک مستقل ہستی ہے، وہ اپنے آپ میں ایک کائنات ہے۔ ہر آدمی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ جیسے چاہتا ہے، ویسے دنیا میں رہے۔ وہ اپنے خوابوں کے مطابق ایک پسندیدہ دنیا کی تعمیر کر سکے۔ لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ انسان کو ایک ایسی دنیا میں رہنا پڑتا ہے جس کو اس نے خود نہیں بنایا ہے۔ وہ ایک ایسے ماحول میں جینے پر مجبور ہے جس کی تشکیل اس نے خود نہیں کی۔ ایسی حالت میں کسی عورت یا مرد کے لیے صرف دو میں سے ایک کا انتخاب ہے— یا تو وہ دنیا سے عدم موافقت کی پالیسی اختیار کرکے خودکشی کرلے، ذہنی خودکشی یا جسمانی خودکشی۔ اس کے لیے دوسرا انتخاب یہ ہے کہ وہ بظاہر غیر مطلوب دنیا کے ساتھ موافقت کرنے کا آرٹ سیکھے، وہ ناممکن سے نہ ٹکرائے اور صرف ممکن کے دائرے میں رہتے ہوئے زندگی گزارے۔

موجودہ دنیا میں ایڈجسٹ مینٹ کی پالیسی ہی واحد قابلِ عمل پالیسی ہے۔ ایڈجسٹ مینٹ کے ذریعے یہ ممکن ہوتا ہے کہ آدمی اپنی توانائی کو ضائع ہونے سے بچائے۔ وہ غیر ضروری ٹنشن (tension) سے محفوظ رہ کر اپنا مطلوب عمل انجام دے سکے۔ وہ درمیان میں رکے بغیر اپنے سفر کو جاری رکھے، یہاں تک کہ اپنی آخری منزل پر پہنچ جائے۔

اختلاف کے وقت

اختلاف زندگی کا ایک حصہ ہے۔ مختلف اسباب سے لوگوں کے درمیان اختلاف ہوتا رہتا ہے۔ جس طرح عام لوگوں کے درمیان اختلاف ہوا ہے، اسی طرح مخلص اور مومن کے درمیان بھی اختلاف پیش آتا ہے۔ اختلاف کے ہونے کو روکا نہیں جا سکتا۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ اختلاف کے باوجود آدمی اپنے آپ کو صحیح رویہ پر قائم رکھے۔

مومن وہ ہے جو اختلاف کو نیت کا مسئلہ نہ بنائے۔ اختلاف کو اسی دائرہ تک محدود رکھے جہاں اختلاف پیدا ہوا ہے۔ ایک معاملہ میں اختلاف کی وجہ سے کسی کو ہر معاملہ میں غلط سمجھ لینا، ایک معاملہ میں اختلاف پیش آنے کے بعد اس کو منافق، بدنیت اور غیر مخلص کہنے لگنا، یہ سراسر غیر اسلامی طریقہ ہے۔

اختلاف پیش آنے کے وقت تعلقات ختم کرنا صحیح نہیں۔ اختلافی مسئلہ پر سنجیدہ بحث جاری رکھتے ہوئے باہمی تعلقات کو بدستور قائم رکھنا چاہیے۔ اختلاف والے شخص سے سلام وکلام بند کرنا یا اس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا چھوڑ دینا کسی بھی حال میں درست نہیں۔

موجودہ دنیا میں ہر چیز برائے امتحان ہوتی ہے۔ اسی طرح اختلاف بھی امتحان کے لیے ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اختلاف کے وقت سخت محتاط رہے۔ وہ مسلسل کوشش کرے کہ اس سے کوئی ایسا غلط ردعمل ظاہر نہ ہو جو اللہ کو پسند نہیں۔

اختلاف کے وقت انصاف پر قائم رہنا بلا شبہ ایک مشکل کام ہے۔ مگر اس کا ثواب بھی بہت زیادہ ہے۔ اسلام میں ہر درست کام عبادت ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک اعلیٰ عبادت ہے کہ اختلاف اور نزاع کی صورت پیش آنے کے باوجود آدمی اپنے دل کو دشمنی اور انتقام کی نفسیات سے بچائے، اختلاف کے باوجود وہ انصاف کی روش پر قائم رہے۔

اختلاف پیش آنا برا نہیں، برا یہ ہے کہ اختلاف پیش آنے کے بعد آدمی امتحان میں پورا نہ اترے۔ اختلاف کے وقت تقویٰ کی حد میں رہنا عظیم اسلامی عمل ہے، اور اختلاف کے وقت تقویٰ کی حد سے نکل جانا انتہائی سنگین قسم کا غیر اسلامی عمل۔

کامیابی کا راز

ایک امام صاحب کا واقعہ ہے۔ وہ اپنی مسجد میں جمعہ کا خطبہ دیتے تھے۔ خطبے سے پہلے وہ اردو میں تقریر کرتے تھے۔ اِس تقریر میں وہ اکثر یہ کرتے کہ اختلافی مسائل میں شدید رویّہ اختیار کرتے۔ وہ اپنی سمجھ کے مطابق، جس مسلک کو درست سمجھتے تھے، اس کے مخالف مسلک پر وہ شدید تنقید کرتے۔

اس پر نمازیوں کی بڑی تعداد امام صاحب کے خلاف ہوگئی۔ لوگ کہنے لگے کہ ان کو خطیب کے مقام سے ہٹا دینا چاہیے۔ میری ملاقات امام صاحب سے ہوئی تو گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ آپ اِس طرح کی تنقیدی تقریریں کیوں کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ تو حق اور ناحق کا معاملہ ہے۔ اگر میں اِس معاملے میں نہ بولوں تو میں گناہ گار ہو جاؤں گا۔

میں نے کہا کہ آپ کی سوچ درست نہیں۔ اصل یہ ہے کہ اجتماعی معاملات میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ حق اور ناحق کو نہیں دیکھا جاتا، بلکہ ممکن اور ناممکن کو دیکھا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی آپ کا طریقہ تھا۔ میں نے مثالیں دے کر امام صاحب کو سمجھایا تو وہ میری بات مان گئے۔ اس کے بعد انھوں نے تنقیدی طریقہ چھوڑ دیا اور حکیمانہ انداز میں اپنی بات بیان کرنے لگے۔

یہ زندگی کا ایک اہم اصول ہے۔ اجتماعی زندگی میں ہمیشہ حکمت کی اہمیت ہوتی ہے۔ جو آدمی حکمت کا طریقہ اختیار نہ کرے، وہ صرف مسائل کو بڑھائے گا، وہ مسائل کو حل نہیں کرسکتا۔ زندگی میں کوئی حقیقی کامیابی صرف صبر کا طریقہ اختیار کرنے والے کو حاصل ہوتی ہے۔ صبر کا طریقہ چھوڑنے کے بعد کسی کو کوئی حقیقی کامیابی ملنے والی نہیں۔

اجتماعی معاملات کو ہمیشہ حق اور ناحق کے نظریے سے دیکھنا صرف جوش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جن لوگوں کے اندر صبر وتحمل ہو، وہ معاملے میں سنجیدگی کے ساتھ غور کریں گے اور پھر وہی طریقہ اختیار کریں گے جو صورتِ حال کی روشنی میں نتیجہ خیز ثابت ہونے والا ہو۔

بلند فکری

موجودہ دنیا میں آدمی ہر وقت اپنے قریبی حالات میں گھرا رہتا ہے۔ ایسی صورت میں صحیح سوچ کا مالک صرف وہ شخص بنے گا جو اپنے اندر بلند فکری (high thinking) کی صفت پیدا کرے، وہ اپنے قریبی حالات سے اوپر اٹھ کر سوچے، وہ غیر متاثر ذہن کے تحت معاملات پر رائے قائم کرے۔ اِس طرزِ فکر کا فارمولا صرف ایک ہے — اپنی سطح سے اوپر اٹھ کر سوچنا:

To think beyond the limit

آدمی ہمیشہ کچھ لوگوں کے درمیان زندگی گزارتا ہے۔ لوگوں کی طرف سے اس کو بار بار ناخوش گوار قسم کے تجربات پیش آتے ہیں۔ اِن ناخوش گوار تجربات کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ اس کے اندر بطور ردّعمل طرح طرح کے غیر حقیقی جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً غصہ، حسد، نفرت، انتقام، احساسِ برتری، یا احساسِ کم تری، وغیرہ۔ ہر آدمی اِسی قسم کے منفی احساسات کے درمیان زندگی گزارتا ہے۔ یہ احساسات جو ہمیشہ ردعمل کی نفسیات کے تحت پیدا ہوتے ہیں، وہ انسان کو غیر حقیقت پسندانہ سوچ میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ وہ فطرت کے مقرر راستے سے ہٹ کر غیر فطری راستے پر چلنے لگتا ہے۔

اِس دنیا میں کامیابی کا طریقہ صرف یہ ہے کہ آدمی اپنے حالات سے اوپر اٹھ کر سوچ سکے، وہ متاثر ذہن کے تحت کوئی فیصلہ نہ کرے۔ وہ اپنے اندر وہ چیز پیدا کرے جس کو غیر متعصّبانہ ذہن، یا تخلیقی فکر (creative thinking) کہا جاتا ہے۔ ایسا ہی انسان اِس دنیا میں درست انداز میں سوچے گا اور اپنے عمل کی درست منصوبہ بندی کرے گا اور آخر کار کامیابی کی منزل تک پہنچے گا۔

بلند فکری کسی انسان کے لیے سب سے بڑی نعمت ہے۔ بلند فکری میں جو چیز سب سے بڑی رکاوٹ ہے، وہ ڈسٹریکشن (distraction) ہے، یعنی ذہن کا مختلف سمتوں میں منتشر ہو جانا۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو ہر قسم کے ذہنی انتشار سے بچائے، تاکہ وہ اپنے اندر صحتِ فکر کو قائم رکھ سکے۔ یہ دراصل صحتِ فکر ہی ہے جو انسان کو حیوان سے ممیز کرتی ہے۔

امت میں اختلاف کا مسئلہ

امت کے افراد میں دینی مسائل کے بارے میں ہمیشہ اختلاف پایا گیا ہے۔ اِس طرح کے اختلافات کے بارے میں کچھ لوگوں نے شدت اختیار کی اور اس کو حق اور ناحق کا مسئلہ بنا دیا۔ لیکن علمائے اسلام کی اکثریت یہ مانتی ہے کہ غیر اساسی امور میں اختلاف فطری چیز ہے۔ ایسے اختلافات کو حق اور ناحق کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے۔ مثال کے طور پر آٹھویں صدی ہجری کے مشہور عالم شمس الدین ابن مفلح (وفات 1326ء) نے اپنی کتاب ''الفروع'' میں اِس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ علماءِ امت کا اختلاف ایک رحمتِ واسعہ ہے: اختِلافُهُم رَحمَةٌ واسِعَةٌ (الفروع مع شرحہ تصحیح الفروع، جلد 11، صفحہ 103)۔

اختلاف کے معاملے کا یہی ایک پہلو نہیں ہے کہ اس میں شدت نہ اختیار کی جائے، بلکہ رایوں کے کثرت کو توسّع پر محمول کرتے ہوئے ہر ایک کا احترام کیا جائے۔ اِس کے علاوہ، اِس کا ایک مزید مثبت پہلو بھی ہے۔ اِس معاملے کی طرف ایک روایت میں اشارہ کیا گیا ہے: اخْتِلَافُ أُمَّتِي رَحْمَةٌ (المقاصد الحسنۃ للسخاوی، حدیث نمبر 39)۔ یعنی میری امت کا اختلاف ایک رحمت ہے۔

اختلاف سادہ طور پر صرف اختلاف نہیں، وہ رائے میں فرق کا نام ہے۔ اختلاف بند ذہن کو کھولتا ہے۔ رایوں کا فرق (difference of opinions) لوگوں کے اندر ڈسکشن اور ڈائیلاگ کا ماحول پیدا کرتا ہے، وہ فکری ارتقا کا ذریعہ ہے۔ یہ اختلاف کا صحت مند پہلو ہے۔ اگر لوگوں میں رائے کا اختلاف نہ ہو تو ایسے گروہ کے اندر ذہنی جمود پیدا ہو جائے گا۔ اِس کے برعکس، جہاں رائے میں فرق پایا جائے، وہاں ذہنی ارتقا کا سلسلہ جاری رہے گا۔

اِس معاملے میں اصل اہمیت کی بات یہ ہے کہ لوگوں کے اندر علمی ذوق ہو۔ اُن کے اندر طلب پائی جائے۔ وہ کسی تعصب کے بغیر تبادلۂ خیال کرنا جانتے ہوں۔ جن لوگوں کے اندر یہ مزاج ہو، اُن کے لیے اختلاف فکری ارتقا کا ذریعہ بن جائے گا، وہ لوگوں کے اندر تخلیقی صلاحیت پیدا کرنے کا باعث بنے گا، نہ کہ ذہنی جمود اور انتشار پیدا کرنے کا سبب۔

تنقید واختلاف

تنقید کو بند کرو، اختلافِ رائے کوختم کرو، تاکہ اُمت میں اتحاد ہو سکے — یہ جملہ گرامر کے اعتبار سے درست ہے، مگر وہ حقیقت کے اعتبار سے بالکل بے معنی ہے۔ کیوں کہ تنقید واختلاف انسانی زندگی کالازمی حصہ ہے، اس لیے وہ کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔ زیادہ صحیح اورقابلِ عمل بات یہ ہے کہ تنقید کو گوارا کرو، اختلافِ رائے کو برداشت کروتا کہ امت میں اتحاد ہو سکے۔ کسی قوم میں اتحاد ہمیشہ اسی دوسرے اصول کی بنیاد پر ہوتا ہے، اور امتِ مسلمہ میں بھی اتحاد اسی بنیاد پر ہوگا۔ اس کے سوااتحاد کی دوسری کوئی صورت نہیں۔

صحابہ وتابعین کے درمیان اختلافات تھے۔ اسی طرح محدثین، فقہا، علما اور صوفیا، ان سب کے درمیان کثرت سے اختلافات تھے۔ حتی کہ قرآن سے ثابت ہے کہ دنیا میں بیک وقت دو پیغمبر ہوں تو ان کے درمیان بھی کبھی اختلاف ہو جاتا ہے (طٰہٰ، 94-20:92)۔ ایسی حالت میں اختلاف کوختم کرکے اتحاد قائم کرنے کی شرط نہ صرف غیرفطری ہے بلکہ وہ غیرشرعی بھی ہے۔

تنقید واختلاف کوئی برائی نہیں۔ وہ فکری ارتقا کا ذریعہ بنتی ہے۔ مثال کے طور پر غزوۂ بدر کے موقع پر ایک صحابی حباب بن منذر نے پیغمبر سے اختلاف کیا۔ اس کے نتیجہ میں زیادہ بہتر میدانِ جنگ کا انتخاب ممکن ہوگیا، وغیرہ (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 620)۔

اصل یہ ہے کہ انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک طالبِ خویش اور دوسرا طالبِ حق۔ طالبِ خویش اپنی ذات میں جیتا ہے۔ اس کی ساری دلچسپی اس میں ہوتی ہے کہ اس کی اپنی شخصیت نمایاں ہو۔ اس کی بڑائی تسلیم کی جائے۔ یہی وہ آدمی ہے جو تنقید واختلاف سے بھڑکتا ہے۔ کیوں کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ تنقید اس کی شخصی عظمت کو گھٹا رہی ہے۔

طالبِ حق کی نفسیات اس سے بالکل جدا ہوتی ہے۔ وہ صرف حق کا طالب ہوتا ہے۔ وہ تنقید کو اپنی ذات پر حملہ نہیں سمجھتا۔ وہ تنقید کو صرف اس نظر سے دیکھتا ہے کہ وہ حق ہے یا ناحق۔ تنقید اگر غلط ہے تو وہ سادہ طور پر اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ لیکن تنقید اگر برحق ہے تو وہ فوراً اس کو قبول کرلے گا۔ کیونکہ ایسی تنقید میں اس کو عین وہی چیز ملتی ہوئی نظر آئی جو پہلے سے اس کا مطلوب ومقصود تھی۔

اختلاف ایک فطری معاملہ

ابن قیم الجوزیہ 691ھ میں دمشق میں پیدا ہوئے۔ 751ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ ان کی ایک مشہور کتاب اعلام الموقعین ہے۔ اس کتاب میں وہ لکھتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق اور حضرت عبد اللہ بن مسعود کے درمیان سو مسائل (نَحْوَ مِائَةِ مَسْأَلَةٍ) میں باہم اختلاف تھا۔ اسی طرح انھوں نے دوسرے صحابہ کے درمیان رایوں کے اختلاف کا ذکر کیا ہے (اعلام الموقعین، جلد 3، صفحہ 102)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اصحابِ رسول میں سے کسی نے بھی اختلاف کو برا نہیں مانا، تمام لوگوں نے اس کو ایک فطری معاملہ سمجھا۔ جس سے نہ باہمی محبت ختم ہوتی اور نہ مسلمانوں کی جماعت میں کوئی انتشار پیدا ہوتا۔

یہ اسلام کی وہ صورت حال ہے جو اصحاب رسول کے زمانہ میں تھی۔ یعنی وہ زمانہ جس کو اسلام کی تاریخ میں معیاری دور کہا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں ہر مسلمان آزادانہ طور پر اختلاف رائے کرتا تھا۔ یہ اختلاف رائے اکثر نہایت شدید الفاظ میں ہوتا تھا۔ اس کے باوجود کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اختلاف اور تنقید کرنے والے کو روکا جائے یا اس کو کوئی ناپسندیدہ کام سمجھا جائے۔

اس کے برعکس، موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو دیکھیے تو صورت حال بالکل مختلف نظر آئے گی۔ آج اگر کسی مسلم شخصیت پر تنقید کر دی جائے تو مسلمان فوراً مشتعل ہو جاتے ہیں۔ وہ ناقد کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ دورِ صحابہ اور موجودہ زمانہ میں اس فرق کا سبب کیا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ صرف ایک اللہ کو بڑا بنائے ہوئے تھے۔ اللہ کے بعد تمام انسان ان کی نظر میں برابر تھے۔ اس لیے انسانوں پر تنقید سے ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ اس کے برعکس، موجودہ زمانہ کے مسلمان اللہ کے ساتھ دوسرے انسانوں کو بھی بڑا بنائے ہوئے ہیں۔ ان انسانی بڑوں کے لیے انھوں نے مبتدعانہ طور پر ''اکابر'' کا لفظ وضع کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان اپنی محبوب شخصیتوں پر تنقید سے بھڑک اٹھتے ہیں۔

دین میں معیار بہر حال اصحاب رسول ہیں۔ مسلمان اگر اس کے سوا کوئی اور معیار بنائیں تو وہ بلاشبہ بدعت ہے، اور بدعت اسلام میں مقبول نہیں۔

اختلاف کا مسئلہ

مسلمانوں کے اندر بڑے پیمانے پر مذہبی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ یہ اختلاف بڑھ کر کبھی تشدد کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ اِن اختلافات کا سبب مدارس کا نصاب ہے۔ ان کے خیال کے مطابق، اگر مدارس کے نصاب میں اصلاح کردی جائے تو اختلاف کا خاتمہ ہوجائے گا اور لوگوں کے اندر اتحاد و اتفاق کی حالت قائم ہوجائے گی۔

مگر یہ اصل صورتِ حال کا کم تر اندازہ (underestimation) ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اختلاف کا سبب فطرتِ انسانی میں ہے، نہ کہ مدارس کے نصاب میں۔ پیدائش کے اعتبار سے، ہر مرد مسٹر ڈفرنٹ (Mr. Different) ہوتا ہے اور ہر عورت مس ڈفرنٹ۔

یہی فطری فرق اختلاف کا اصل سبب ہے۔ اگر تمام مدارس کا نصاب ایک کردیا جائے تب بھی اختلاف باقی رہے گا، کیوں کہ خواہ نصاب کی سطح پر اختلاف نہ ہو تب بھی فطرت کی سطح پر اختلاف موجود رہے گا، وہ کبھی ختم ہونے والا نہیں۔

حضرت علی (وفات 40ھ) اور حضرت معاویہ (وفات 60ھ) دونوں ایک ہی مدرسہ، مدرسۂ نبوت، کے تعلیم یافتہ تھے، اِس کے باوجود دونوں میں اختلاف پیدا ہوا۔ ابوالحسن اشعری (وفات 936ء) معتزلی عالم ابوعلی الجبائی (وفات 916ء) کے شاگرد تھے، اس کے باوجود دونوں میں اختلاف پیدا ہوا۔ موجودہ زمانے میں سرسید احمد خاں (وفات 1898ء) اور مولانا قاسم نانوتوی (وفات 1880ء) دونوں ایک ہی مدرسہ کے تعلیم یافتہ تھے، اِس کے باوجود دونوں کے درمیان اختلاف پیدا ہوا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی (وفات 1949ء) اور مولانا حسین احمد مدنی (وفات 1957ء) دونوں ایک ہی مدرسہ کے تعلیم یافتہ تھے، اِس کے باوجود دونوں میں اختلاف پیدا ہوا۔ مولانا سید سلیمان ندوی (وفات 1953ء) اور مولانا مسعود علی ندوی (وفات 1967ء) دونوں ایک ہی مدرسہ کے تعلیم یافتہ تھے، اِس کے باوجود دونوں میں اختلاف پیدا ہوا۔

اصل یہ ہے کہ خواہ دو آدمیوں نے ایک ہی مدرسہ اور ایک ہی نصاب کے تحت تعلیم پائی ہو، لیکن طرزفکر (way of thinking) کی سطح پر ہمیشہ ایک آدمی اور دوسرے آدمی کے درمیان فرق ہوتا ہے۔ یہی فرق ہے جو اختلاف کا سبب بن جاتا ہے۔ اِس کے بعد وہ بڑھ کر نفرت اور تشدد تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ اختلاف یا فرق چوں کہ فطرتِ انسانی کا حصہ ہے، اِس لیے وہ کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ ایسی حالت میں اختلاف کے مسئلے کا حل یہ نہیں ہے کہ ناکام طور پر اس کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے، بلکہ اس کا حل یہ ہے کہ لوگوں کو اُس اصول کی تعلیم دی جائے جس کو ''اختلاف کے باوجود اتحاد'' کہا جاتا ہے۔ یعنی رائے (opinion) کی سطح پر اختلاف، سماجی تعلق (social relationship) کی سطح پر اتفاق۔

انسانوں کے طرزفکر میں اختلاف کوئی غیر مطلوب چیز نہیں، بلکہ وہ عین مطلوب ہے۔ کیوں کہ اِس اختلاف کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کے درمیان ڈسکشن اور ڈائیلاگ ہوتا ہے، اور ڈسکشن اور ڈائیلاگ ذہنی ارتقا کا ذریعہ ہے۔ جہاں ڈسکشن اور ڈائیلاگ نہ ہو، وہاں یقینی طور پر ذہنی جمود (intellectual stagnation) پیدا ہوجائے گا، اور ذہنی جمود سے زیادہ تباہ کن اور کوئی چیز انسان کے لیے نہیں۔

ابوعمرو زَبّان بن العلاء مکہ میں 68ھ میں پیدا ہوئے۔ 154ھ میں کوفہ میں ان کی وفات ہوئی۔ علم و ادب میں وہ بہت اونچا درجہ رکھتے تھے۔ ان کا ایک قول ہے کہ ضرورت مندرہ جانا اس سے بہتر ہے کہ نااہل لوگوں سے حاجت روائی کی درخواست کی جائے (احْتِمَالُ الْحَاجَةِ خَيْرٌ مِنْ طَلَبِهَا مِنْ غَيْرِ أَهْلِهَا)۔

ان کا ایک اور قول یہ ہے کہ دو آپس میں محبت کرنے والوں کے لیے کوئی مجلس تنگ نہیں ہوتی لیکن دو نفرت کرنے والوں کے لیے ساری دنیا تنگ ہوجاتی ہے (مَا ضَاقَ مَجْلِسٌ بِمُتَحَابِّينَ، وَمَا اتَّسَعَتِ الدُّنْيَا لِمُتَبَاغِضِينَ) شذرات الذہب لابن العماد، جلد 2، صفحہ 250۔ (ڈائری، مولانا وحید الدین خاں، 2 جنوری 1995)

اختلاف ایک صحت مند ظاہرہ

علامہ ابن تیمیہ کی کتاب الفتاوی الکبریٰ (مجموعہ فتاویٰ) میں ایک واقعہ اِن الفاظ میں آیا ہے:

صنَّفَ رجلٌ كتابًا سمّاه كتاب "الاختلاف"، فقال أحمدُ بن حنبلٍ: سمِّهِ كتاب "السَّعَة" (جلد 3، صفحہ 238)۔ یعنی ایک شخص (اسحاق بن بہلول) نے ایک کتاب لکھی۔ اُس نے اِس کتاب کا نام "کتاب الاختلاف" رکھا۔

یہ کتاب اُس نے امام احمد بن حنبل کی خدمت میں پیش کی۔ امام احمد بن حنبل نے اس کتاب کو دیکھ کر کہا کہ تم اِس کتاب کا نام کتاب الاختلاف نہ رکھو، بلکہ تم اِس کتاب کا نام کتاب السعۃ (توسع والی کتاب) رکھو۔

امام احمد بن حنبل کا مطلب یہ تھا کہ شرعی مسائل میں اختلاف محض اختلاف نہیں ہے، بلکہ وہ توسّع کی بنا پر ہے، یعنی ہر رائے میں صحت کا امکان ہے۔

تاہم یہ توسع سادہ مفہوم میں محض رواداری کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ اُس کا ایک مثبت پہلو ہے۔ وہ یہ کہ اختلاف ڈسکشن (discussion) کا ذریعہ بنتا ہے اور ڈسکشن سے ذہنی ارتقا (intellectual development) کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

اختلاف سے مراد نزاع نہیں ہے، بلکہ اُس سے مراد سادہ طور پر رائے کا فرق (difference) ہے۔ رائے کا یہ فرق یا اختلاف بے حد اہم ہے۔ اِسی کی بنا پر ڈسکشن اور ڈائیلاگ ہوتا ہے اور تبادلۂ خیال (exchange of thought) وجود میں آتا ہے۔ اگر رایوں میں فرق نہ ہو تو باہمی تبادلۂ خیال وجود میں نہیں آئے گا، حالاں کہ ذہنی ارتقا کے لیے تبادلۂ خیال بے حد ضروری ہے۔ جہاں تبادلۂ خیال نہیں، وہاں ذہنی ارتقا بھی نہیں۔

واضح ہو کہ اختلاف اور مخالفت میں فرق ہے۔ اختلاف ایک مثبت عمل ہے۔ اس کے برعکس، مخالفت سر تا سر ایک منفی عمل۔ اختلاف فکری ارتقا کا سبب ہے اور مخالفت فکری جمود (intellectual stagnation) کا سبب۔

اختلاف ایک برکت

عمر بن عبدلعزیز (وفات 101ھ) کو اسلام کی تاریخ میں پانچویں خلیفۂ راشد کا درجہ دیا جاتا ہے۔ ان کا ایک قول ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے: مَا سَرَّنِي لَوْ أَنَّ أَصْحَابَ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وسلم لَمْ يَخْتَلِفُوا، لِأَنَّهُمْ لَوْ لَمْ يَخْتَلِفُوا لَمْ تَكُنْ رُخْصَةٌ (الفقیہ والمتفقہ للخطیب البغدادی، جلد 2، صفحہ 116)۔ یعنی میرے لیے یہ چیز باعث مسرت نہیں کہ اصحاب محمد میں اختلاف نہ ہوتا، اس لیے کہ اگر وہ اختلاف نہ کرتے تو ہم کو رخصت کا فائدہ نہ ملتا۔

عبادتی امور میں صحابہ کا اختلاف بعد کے زمانے میں مختلف فقہی اسکول کا ذریعہ بن گیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ بعد کے علما نے اختلاف کے معاملے میں ترجیح کا طریقہ اختیار کیا۔ یعنی مختلف مسالک میں کسی ایک طریقہ کو راجح اور کسی کو مرجوح قرار دینا۔ اس سے فقہ میں مختلف مدرسے بن گئے۔ اور بالآخر امت کے اندر فقہی تشدد پیدا ہو گیا۔

عمر بن عبدالعزیز کا یہ قول ایک حدیث پر مبنی ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ بِأَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمُ اهْتَدَيْتُمْ (جامع بیان العلم وفضلہ، حدیث نمبر 1760)۔ یعنی میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں، تم ان میں سے جس کی بھی پیروی کرو، تم ہدایت پر رہو گے۔

صحابہ کا اختلاف اساسی امور (basics) میں نہیں ہے۔ بلکہ وہ جزئی امور (non-basics) میں ہے۔ اس طرح کے جزئی امور میں ہمیشہ تنوع (diversity) مطلوب ہوتی ہے۔ اس طرح کے جزئی امور میں توحد (یکسانیت) تلاش کرنا، غیر فطری ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس طرح کے جزئی اختلاف کو تنوع پر محمول کیا جائے، ان کو توحد کا موضوع نہ بنایا جائے۔ اس اصول کو اختیار کرنے کی صورت میں امت کے اندر اتحاد باقی رہے گا۔ اس کی خلاف ورزی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ امت کے اندر اختلاف وانتشار پیدا ہو جائے گا۔ ایک امت کئی فرقوں میں بٹ جائے گی۔ یہ اختلاف بڑھ کر غلو اور تشدد کی صورت اختیار کرلے گا۔ اسلام کے بعد کے زمانے کی تاریخ اس کی تصدیق کرتی ہے۔

فقہی مسائل میں اختلاف

فقہی مسائل میں اختلاف کا معاملہ زیادہ تر عبادت کے طریقوں میں اختلاف سے تعلق رکھتا ہے۔اس معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي (صحیح البخاری، حدیث نمبر 631)۔یعنی تم نماز اس طرح پڑھو جیسا کہ تم مجھ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔

اسی طرح آپ نے فرمایا:

خُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَكُمْ (سنن الکبریٰ للبیہقی، حدیث نمبر 9524)۔یعنی مناسک میں میری پیروی کرو۔

اس طرح کی احادیث کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک ہی غیر اختلافی ماڈل تھا۔لیکن رسول اللہ کے بعد صحابہ عملی اعتبار سے قابل تقلید نمونہ بن گئے۔رسول اللہ کی وفات کے بعد صحابہ مختلف بیرونی علاقوں میں پھیل گئے۔لوگوں نے دیکھا کہ صحابہ کے عبادتی طریقوں میں کامل یکسانیت نہیں پائی جاتی۔مثلاً نماز میں قرأت سے پہلے بسم اللہ پڑھنا یا نہ پڑھنا، امام کے پیچھے مقتدی کا قرأتِ فاتحہ کرنا یا نہ کرنا، نماز میں آمین بالسر اور آمین بالجہر کا اختلاف، وغیرہ۔

صحابہ کے درمیان اس قسم کا اختلاف (صحیح تر لفظ میں فرق) پہلے بھی موجود تھا، مگر پہلے اس فرق کو بحث کا موضوع نہیں بنایا جاتا تھا۔بعد کے زمانے میں جب کہ مسلم معاشرے میں نومسلموں کی تعداد زیادہ ہوگئی تو اس فرق پر سوال کیا جانے لگا۔اب اس اختلاف کو موضوع بنا کر یہ سوال کیا جانے لگا کہ ان میں سے صحیح تر ماڈل کون سا ہے۔یہ نومسلم جن مذاہب سے نکل کر آئے تھے، وہاں انھوں نے دیکھا تھا کہ اس قسم کے فرق کو بنیادی اہمیت دی جاتی ہے۔اس قسم کے فرق کی بنیاد پر دوسرے مذاہب میں الگ الگ فرقے بنے ہوئے ہیں۔اپنے اس قدیم ذہن کو انھوں نے اسلام پر بھی منطبق (apply) کر دیا۔اس ذہن کے تحت وہ اس وقت کے مسلم علما سے سوالات کرنے

لگے۔ یہی وہ ظاہرہ ہے جس نے اسلام میں مذہبی فرقہ بندی کے دور کا آغاز کردیا۔

اس معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث پیشگی ہدایت کے طور پر موجود تھی۔ اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں: أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ بِأَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمُ اهْتَدَيْتُمْ (جامع بیان العلم وفضلہ، حدیث نمبر 1760)۔ یعنی میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں، ان میں سے جس کی بھی تم پیروی کروگے تم ہدایت پر ہوگے۔ اس حدیث کے مطابق صحابہ کے درمیان عبادت کے طریقوں میں اختلاف تنوع (diversity) کی بنا پر تھا، یعنی ہر طریقہ جو کسی صحابی سے ثابت ہو وہ یکساں طور پر درست ہے۔ عقلی طور پر تنوع کا یہ طریقہ قابلِ فہم تھا، کیوں کہ صحابہ کا اختلاف یا فرق صرف جزئیات (non-basics) میں تھا، وہ کلیات (basics) میں نہ تھا۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ فطری قانون کے مطابق جزئیات میں ہمیشہ فرق پایا جاتا ہے، جزئیات میں یکسانیت (uniformity) کا حصول ممکن نہیں۔

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بعد کے زمانے میں امت کے اندر یہ اختلاف مسلکی شدت کا سبب بن گیا۔ جب کہ یہ اختلاف خود صحابہ میں موجود تھا، مگر صحابہ کے درمیان ان اختلافات کی بنیاد پر کوئی مسلکی تشدد نہیں پیدا ہوا۔ اس کا سبب واضح طور پر یہ تھا کہ صحابہ مختلف طریقوں پر عبادت کرتے تھے، لیکن ان میں سے کسی نے کبھی یہ نہیں کہا کہ فلاں طریقہ افضل ہے، اور فلاں طریقہ غیر افضل۔ وہ مختلف طریقوں پر اس طرح عمل کرتے تھے جیسے کہ ہر طریقہ یکساں طور پر درست ہو۔ مگر بعد کو ایسا ہوا کہ انھی اختلافات کو لے کر امت مختلف فرقوں، بلکہ متحارب گروہوں میں بٹ گئی۔ جب کہ اس قسم کی فرقہ بندی شریعت میں سخت نامحمود (الروم، 30:32) ہے۔ اس معاملے میں اصل غلطی عباسی دور کے علمائے فقہ کی ہے، جن کو ائمۂ مجتہدین کہا جاتا ہے۔ انھوں نے اس اختلاف کے موضوع پر بڑی تعداد میں کتابیں لکھیں۔ انھوں نے یہ کیا کہ ان اختلافات کو بطور خود وہ درجہ دے دیا جو کہ شریعت میں ان کا درجہ نہ تھا، اور نہ کسی صحابی نے ان اختلافات کے بارے میں ایسا کہا تھا۔

ان فقہا نے یہ کیا کہ انھوں نے ترجیح (preference) کے نام سے بطور خود ایک اصول وضع کیا۔ انھوں نے لمبی بحثیں کر کے ایک طریقے کو راجح اور دوسرے طریقے کو مرجوح ثابت کرنے کی

کوشش کی۔ انھوں نے اختلافات کو بیان کیا، اور پھر ایک مسلک کو لے کر کہا:

هذا أَحْوَطُ (یہ زیادہ محتاط طریقہ ہے)،

هذا أَفْضَلُ (یہ زیادہ افضل طریقہ ہے)۔

انھوں نے بطور خود ایک مسلک کو اولیٰ اور دوسرے مسلک کو غیر اولیٰ قرار دیا۔ یہ بلا شبہ علمائے فقہ کی ایک اجتہادی غلطی تھی۔ یہی وہ اجتہادی غلطی ہے جس نے امت میں فقہی تشدد کا آغاز کر دیا، جو پھر کبھی ختم نہ ہوسکا۔

یہ انسان کی نفسیات ہے کہ اس کے لیے جب انتخاب افضل اور غیر افضل کے درمیان ہو تو وہ ہمیشہ افضل کا انتخاب کرے گا۔ وہ اپنے انتخاب کو درست ثابت کرنے کے لیے ہر طرح کے دلائل دے گا۔ بعد کے زمانے میں انسان کی یہی نفسیات بروئے کار آئی، اور فقہی مسلک میں اختلاف کے نتیجے میں نفرت اور تشدد حتیٰ کہ جنگ تک کو جائز کرلیا گیا۔

اس معاملے میں دورِ اول کے علما کو بری الذمہ قرار دینے کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ ایک مسلک کو قابلِ ترجیح قرار دینے کے باوجود وہ مسلک کے بارے میں متشدد نہ تھے۔ مثلاً حنفی اور شافعی فقہا نماز میں بسم اللہ پڑھنے کے قائل تھے، جب کہ مالکی فقہا اس کے قائل نہ تھے، مگر دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کے پیچھے نماز ادا کی۔ اسی طرح امام شافعی فجر کی نماز میں دعائے قنوت پڑھنے کے قائل تھے، جب کہ امام ابوحنیفہ اس کے قائل نہ تھے، مگر جب امام شافعی امام ابوحنیفہ کے مقبرہ کے پاس گئے اور وہاں فجر کی نماز ادا کی تو انھوں نے دعائے قنوت نہیں پڑھی، وغیرہ۔ مگر اس طرح کا عمل صرف انفرادی اخلاق کو ثابت کرتا ہے، اور شرعی اختلاف کے حل کے لیے شرعی اصول درکار ہے، نہ کہ انفرادی اخلاق۔

دینی امور میں جب کسی ایک طریقہ کو دوسرے طریقے کے مقابلے میں افضل بتایا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ افضل طریقہ میں زیادہ ثواب ہے، اور غیر افضل طریقہ میں کم ثواب ہے۔ ایک فقہی عالم اگر افضلیت اور غیر افضلیت کی زبان میں اس طرح کا مسئلہ بتائے، اور اس کے بعد مخالف مسئلہ بتانے والے عالم کے پیچھے ایک بار نماز پڑھ لے تو اس قسم کے عمل سے فقہی تشدد ختم نہیں ہوسکتا۔ اس

کا یہ عمل لوگوں کی نظر میں ذاتی نوعیت کا ایک اخلاقی برتاؤ یا حسنِ معاشرت قرار پائے گا، نہ کہ کوئی شرعی مسئلہ۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جب حسن معاشرت اور دینی افضلیت کے درمیان انتخاب (choice) ہو تو آدمی ہمیشہ اس طریقے کو لے گا جس کو افضل بتایا گیا ہے، اور غیر افضل پر عمل کرنے والے کو کم تر سمجھ لے گا۔ اس طرح کے شرعی معاملے میں حسنِ معاشرت کبھی فیصلے کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ یہ مزاج یقیناً بڑھتے بڑھتے آخر کار فقہی تشدد اور فرقہ بندی کی صورت اختیار کرلے گا۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ امت کے اندر بعد کے زمانے میں جو فقہی تشدد اور مسلکی فرقہ بندی پیدا ہوئی، اس کا سبب خود دین کی تعلیمات میں نہ تھا۔ اس کا سبب تمام تر علمائے متقدمین کی اس اجتہادی غلطی میں تھا کہ انھوں نے غیر ضروری طور پر ایک ایسے معاملے میں توحد کا اصول اختیار کیا جو کہ دراصل توسع کا معاملہ تھا۔ ایک دینی اختلاف جو دراصل توسع (diversity) کی بنا پر تھا، اس کے معاملے میں انھوں نے توحد (uniformity) کے اصول کو منطبق کرنا چاہا۔ ان کی یہ کوشش یقینی طور پر غیر فطری تھی، اس بنا پر توحد کے نام پر کی جانے والی کوشش تشدد کا ذریعہ بن گئی، اور آخر کار امت واحدہ، امتِ متفرقہ میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔

اس واقعے کی ذمے داری ساری کی ساری فقہائے متقدمین پر ہے۔ اس صورتِ حال کی اصلاح صرف اس وقت ہوسکتی ہے، جب کہ فقہائے متقدمین کے بارے میں یہ مانا جائے کہ انھوں نے بطورِ خود اختلافی مسائل کے حل کے لیے جو طریقہ اختیار کیا وہ ان کی ایک اجتہادی غلطی تھی، اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ اس غلط روش کو ترک کردیا جائے۔

اعلان

مولانا وحید الدین خاں صاحب نے بہت سارے لوگوں کو خطوط لکھے یا ان کے خطوط کے جوابات دیے ہیں۔ جن حضرات کے پاس یہ خط موجود ہیں، براہِ کرم ان کی فوٹو کاپی یا اصل خط ہمیں ارسال فرمائیں تا کہ ان کو ہم اپنے ریکارڈ میں محفوظ رکھ سکیں، شکریہ۔

تفصیل کے لیے رابطہ قائم کریں: 9999944119

اختلاف کے باوجود

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تیسرے خلیفہ راشد تھے۔ آخر عمر میں بعض جھوٹی خبروں کی بنا پر ایک ہزار سے زیادہ آدمی مدینہ آئے۔ انھوں نے مدینہ پہونچ کر کافی شوروغل کیا اور آخر کار حضرت عثمان کے مکان کو گھیر لیا۔ اگرچہ حضرت عثمان کے خلاف ان کا الزام سراسر بے بنیاد تھا، مگر یہ مسلمان آپ سے اتنا برہم ہوئے کہ آپ کا گھر سے نکلنا اور گھر میں پانی جانا بند کر دیا۔ یہاں تک کہ 18 ذی الحجہ 35ھ کو حملہ کرکے آپ کو شہید کر دیا۔ بوقت وفات آپ کی عمر 82 سال تھی۔

حضرت عثمان کا محاصرہ تقریباً 40 دن تک جاری رہا۔ بلوائیوں نے جب حضرت عثمان کو گھیر لیا اور مکان سے نکلنے پر پابندی لگا دی تو آپ کے لیے مسجد جانا ممکن نہ رہا۔ خلیفہ کی حیثیت سے نمازوں کی امامت آپ ہی فرماتے تھے۔ جب آپ کا مسجد جانا بند ہو گیا تو بلوائیوں کا سردار غافقی بن حرب عکّی امام بن گیا۔ اس نے مدینہ کی مسجد میں نمازوں کی امامت شروع کر دی۔

یہ مدینہ کے مسلمانوں کے لیے بڑی سخت آزمائش کی بات تھی۔ ایک طرف وہ اپنے لیے ضروری سمجھتے تھے کہ مسجد میں جا کر جماعت کے ساتھ نماز ادا کریں، دوسری طرف وہ دیکھ رہے تھے کہ ایک شخص جو کھلا ہوا مفسد اور غلط کار ہے، وہی مسجد کا امام بنا ہوا ہے۔ اس نازک حالت میں ایک شخص حضرت عثمان سے ملا اور ان سے پوچھا کہ ایسی حالت میں ہم کیا کریں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں یہ ہدایت فرمائی کہ تم لوگ اس کے پیچھے نماز ادا کرو۔ آپ نے فرمایا:

فَإِذَا أَحْسَنَ النَّاسُ فَأَحْسِنْ مَعَهُمْ، وَإِذَا أَسَاءُوا فَاجْتَنِبْ إِسَاءَتَهُمْ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 695)۔ یعنی، جب وہ لوگ کوئی نیک کام کریں تو اس میں ان کا ساتھ دو اور جب وہ لوگ کوئی برا کام کریں تو ان کی برائی سے دور رہو۔

خلیفہ راشد کے اس واقعہ میں عظیم الشان نمونہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص سے ہمیں خواہ کتنی ہی زیادہ شکایت ہو، اس کے بارے میں اظہار رائے کرتے ہوئے ہمیں ہمیشہ انصاف پر قائم رہنا چاہیے۔ ہمیں اپنے اختلاف کو حد کے اندر رکھنا چاہیے، نہ یہ کہ اختلاف پیدا ہونے کے بعد ہم حد کے باہر نکل جائیں۔

اختلاف کے باوجود اعتراف

صحابہ ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جنھوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست تربیت پائی ہو۔ صحابہ کا ہر قول اور ہر عمل پیغمبر اسلام کی تربیت کا نتیجہ تھا۔ اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ صحابہ پیغمبرانہ اخلاقیات کا توسیعی نمونہ (extended example) تھے۔

صحابہ کے دو گروہ تھے— انصار اور مہاجرین۔ مہاجر صحابہ میں سے دو کے نام یہ ہیں: سعد بن ابی وقاص (وفات 55ھ)، خالد بن الولید (وفات 21ھ)۔ ان دونوں کے تعلق سے ایک روایت حدیث کی کتابوں میں آئی ہے۔ روایت یہ ہے: كَانَ بَيْنَ خَالِدِ بْنِ الْوَلِيدِ ،وَبَيْنَ سَعْدٍ كَلَامٌ، قَالَ: فَتَنَاوَلَ رَجُلٌ خَالِدًا عِنْدَ سَعْدٍ، قَالَ: فَقَالَ سَعْدٌ: مَهْ، فَإِنَّ مَا بَيْنَنَا لَمْ يَبْلُغْ دِينَنَا (مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث نمبر 25535)۔ یعنی خالد بن الولید اور سعد کے درمیان (نزاعی) تکرار ہوگئی۔ راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد ایک شخص نے سعد سے خالد کی برائی بیان کی۔ تو سعد نے کہا: دور ہو، ہم دونوں کے درمیان جو معاملہ ہے، وہ ہمارے دین تک نہیں پہنچے گا۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دو صحابی، سعد بن ابی وقاص اور خالد بن الولید کے درمیان کوئی ذاتی نزاع پیدا ہوگئی۔ کسی معاملے پر بات کرتے ہوئے دونوں کے درمیان تکرار ہوگئی۔ اس بات کو لے کر ایک شخص نے سعد بن ابی وقاص سے خالد بن الولید کی برائی بیان کی۔ لیکن سعد ایک اعلیٰ اخلاق والے آدمی تھے۔ انھوں نے فوراً کہا کہ ہمارے اور خالد کے درمیان جو اختلاف ہے، وہ ایک ذاتی نوعیت کا اختلاف ہے۔ اس اختلاف کو ہم ذاتی حد تک رکھیں گے۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ اس کی بنا پر ہم ایک دوسرے کو دین کے اعتبار سے برا سمجھنے لگیں۔ اجتماعی زندگی میں باہمی نزاع کا پیدا ہونا، ایک عام بات ہے، لیکن اہل ایمان کو چاہیے کہ وہ ذاتی معاملے کو دین سے الگ رکھیں۔ ذاتی شکایت کو وہ ایک دوسرے کے دین تک نہ لے جائیں۔ ذاتی اختلاف کے باوجود وہ دینی اعتبار سے ایک دوسرے کے اعتراف میں کمی نہ آنے دیں۔

وسیع تر مفاد

جس زمانے میں حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان جنگ ہو رہی تھی، قیصر روم (قسطنطنیہ) نے ارادہ کیا کہ وہ مسلم دنیا پر حملہ کردے۔ اس کے ذہن میں آیا کہ اِس وقت مسلمان باہمی لڑائی میں مبتلا ہیں۔ اگر اس وقت میں نے حملہ کر دیا تو میں شام ومصر وغیرہ علاقہ پر دوبارہ قبضہ کرسکتا ہوں۔ حضرت معاویہ کو اس کی خبر ملی تو انھوں نے فوراً قیصر روم کے نام ایک خط روانہ کیا، اس میں لکھا ہوا تھا:

وَاللّٰهِ لَئِنْ لَمْ تَنْتَهِ وَتَرْجِعْ إِلَى بِلَادِكَ يَا لَعِينُ لَأَصْطَلِحَنَّ أَنَا وَابْنُ عَمِّي عَلَيْكَ وَلَأُخْرِجَنَّكَ مِنْ جَمِيعِ بِلَادِكَ، وَلَأُضَيِّقَنَّ عَلَيْكَ الْأَرْضَ بِمَا رَحُبَتْ (البدایۃ والنہایۃ، جلد 8، صفحہ 127)۔ یعنی، اللہ کی قسم! اگر تم باز نہ آئے اور اپنے ملک کی طرف واپس نہ ہوئے تو میں اپنے چچازاد بھائی کے ساتھ تیرے خلاف صلح کرلوں گا پھر تیرے پورے ملک پر قبضہ کر کے زمین کی وسعت کے باوجود اس کو تیرے اوپر تنگ کردوں گا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت معاویہ کے اس خط کے بعد قیصر روم نے اپنا حوصلہ کھودیا۔ اس نے فوجوں کی تیاری روک دی۔ اس نے سمجھ لیا کہ اب مسلمانوں سے جنگ چھیڑنا اپنی مزید بربادی کو دعوت دینا ہے۔ یہ زندہ لوگوں کا طریقہ ہے۔ ان کے اندر آپس میں اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ مگر جب معاملہ وسیع تر مفاد کا آجائے تو وہ اپنے اختلاف کو ختم کرکے ایک ہوجاتے ہیں۔ ان کے اختلاف کی ایک حد ہوتی ہے۔ حد کے آجانے کے بعد ان کا اختلاف باقی نہیں رہتا۔

زندہ انسان دوستی کے باوجود کسی کی بے جا حمایت نہیں کرتا۔ وہ دشمنی کے باوجود کوئی چھوٹی حرکت نہیں کرتا۔ وہ انفرادی جھگڑے کے باوجود اجتماعی امور میں متحد ہوجاتا ہے۔ وہ شخصی کدورت کے باوجود اسلامی تعلق میں فرق نہیں آنے دیتا۔ زندہ انسان کسی سے نزاع پیش آنے کے باوجود اس کی خصوصیات کا اعتراف کرتا ہے۔ وہ رنجش پیدا ہونے کے باوجود امانتوں کو ادا کرتا ہے۔ زندہ انسان کسی حال میں پست حرکت نہیں کرتا، وہ کسی حال میں اپنی انسانیت کو نہیں کھوتا۔ زندہ انسان دشمن ہوسکتا ہے مگر وہ کمینہ نہیں ہوسکتا۔ زندہ انسان کو شکایت ہوسکتی ہے مگر یہ ممکن نہیں کہ جس سے اس کو شکایت ہو اس کے خلاف وہ جھوٹا الزام لگانے لگے۔

تنقید کوسن کر

خلیفہ ہارون الرشید (193-149ھ) نے ایک بار اپنے وزیر سے کہا کہ مجھ کو کسی بزرگ کے پاس لے چلو۔ وہ خلیفہ کو الفضیل بن عیاض (187-105ھ) کے پاس لے گیا۔ اس سلسلہ میں لمبا قصہ کتابوں میں نقل ہوا ہے۔

خلیفہ کے ساتھ اس کے کئی درباری تھے۔ انھوں نے فضیل سے مصافحہ کیا۔ خلیفہ نے بھی مصافحہ کیا۔ خلیفہ نے اپنا ہاتھ جب فضیل کے ہاتھ میں رکھا تو انھوں نے کہا کہ کتنا زیادہ نرم ہے یہ ہاتھ، اگر کل کے دن وہ اللہ کے عذاب سے بھی بچ جائے (يَا لَهَا مِنْ كَفٍّ مَا أَلْيَنَهَا، إِنْ نَجَتْ غَدًا مِنْ عَذَابِ اللهِ)۔ اس کے بعد خلیفہ نے فضیل سے کہا کہ کچھ نصیحت کیجیے۔ انھوں نے تلخ نصیحت کے انداز میں کچھ کلمات کہے۔ خلیفہ نے کہا کہ اور کچھ فرمائیے۔ فضیل نے مزید کچھ کہا۔ اس طرح وہ سخت تنقیدی انداز میں دیر تک خلیفہ کو ڈرانے والی باتیں کرتے رہے۔ خلیفہ ان کی نصیحتوں کو سن کر رو پڑا۔ آخر میں اس نے اپنے وزیر سے کہا کہ جب تم مجھ کو کسی آدمی کے پاس لے جاؤ تو اسی طرح کے آدمی کے پاس لے چلو۔ یہ مسلمانوں کے سردار ہیں: إِذَا دَلَلْتَنِي عَلَى رَجُلٍ فَدُلَّنِي عَلَى مِثْلِ هَذَا، هَذَا سَيِّدُ الْمُسْلِمِينَ (حلیۃ الاولیاء للاصفہانی، جلد 8، صفحہ 107-106)۔

آدمی کے اندر اگر صحیح مزاج ہو تو وہ نصیحت کو سن کر اس سے سبق لے گا، خواہ یہ نصیحت کتنے ہی سخت تنقیدی الفاظ میں کی گئی ہو۔ ایسا آدمی نصیحت کو اس کے معنوی اعتبار سے دیکھے گا نہ کہ اس کے لفظی اعتبار سے، وہ اس کو اصولی حیثیت سے لے گا نہ کہ ذاتی حیثیت سے۔

صحیح مزاج اگر بادشاہ کے اندر ہو تو وہ بھی تنقید کو سن کر اسے برداشت کرے گا۔ اور ایک معمولی آدمی بھی اگر صحیح مزاج نہ رکھتا ہو تو وہ تنقید کو سن کر بگڑ جائے گا۔ تنقید کسی آدمی کو پہچاننے کی سب سے زیادہ یقینی کسوٹی ہے۔ تنقید کو سن کر جو آدمی اپنے ذہنی توازن کو نہ کھوئے وہی اعلیٰ انسان ہے۔ اور جو شخص تنقید کو سن کر بگڑ جائے، اس کے متعلق یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ اپنے اندر اعلیٰ انسان والی خصوصیات رکھتا ہے — تنقید کسی آدمی کی انسانیت اور اس کے تقوی کی پہچان کراتی ہے۔

ذہنی ارتقا کا ذریعہ

علمائے سلف کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے درمیان دینی مسائل میں کثرت سے اختلاف پایا جاتا تھا۔ اِس کے باوجود ہر عالم دوسرے عالم کا احترام کرتا تھا۔ اِس سلسلے میں یہاں دو واقعات نقل کیے جاتے ہیں: امام احمد بن حنبل اور علی بن المدینی کے درمیان ایک مسئلے پر بحث ہوئی اور بحث ایسی ہوئی کہ دونوں طرف سے آوازیں بلند ہونے لگیں۔ مجھے اندیشہ ہونے لگا کہ آپس میں بدمزگی پیدا ہوجائے گی (وَارْتَفَعَتْ أَصْوَاتُهُمَا حَتَّى خِفْتُ أَنْ يَقَعَ بَيْنَهُمَا جَفَاءٌ)، لیکن علی بن المدینی واپس جانے لگے تو امام احمد بن حنبل نے ان کے ساتھ اِس درجہ احترام کا معاملہ کیا کہ آگے بڑھ کر ان کی رکاب تھام لی (جامع بیان العلم لابن عبد البر، جلد 2، صفحہ 107)۔

اِسی طرح یونس صدفی امام شافعی کے ایک ممتاز شاگرد ہیں۔ ایک مرتبہ کسی مسئلے میں استاذ سے خوب بحث ہوئی۔ پھر جب اگلی ملاقات ہوئی تو امام شافعی نے ان کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا کہ کیا یہ بات بہتر نہ ہوگی کہ ہم بھائی بھائی بن کر رہیں، خواہ کسی مسئلے میں بھی ہمارے درمیان اتفاق پیدا نہ ہوسکے: أَلَا يَسْتَقِيمُ أَنْ نَكُونَ إِخْوَانًا وَإِنْ لَمْ نَتَّفِقْ فِي مَسْأَلَةٍ (سیر اعلام النبلاء، جلد 10، صفحہ 16)۔

اِس طرح کے واقعات کا مطلب صرف باہمی احترام (mutual respect) نہیں ہے، بلکہ اِن واقعات میں ایک اور زیادہ بڑا پہلو ہے اور وہ ہے اختلافِ رائے (difference of opinion) کا احترام۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ اختلافِ رائے کو علمی پہلو سے دیکھنا، نہ کہ شخصی پہلو سے۔

اختلافِ رائے کا احترام کوئی سادہ بات نہیں، اس کا براہِ راست تعلق ذہنی ارتقا سے ہے۔ جس ماحول میں اختلافِ رائے کو برا نہ سمجھا جائے، وہاں لازماً ڈسکشن کا ماحول ہوگا۔ لوگ علمی دلائل کے ذریعے اپنا اپنا نقطۂ نظر بیان کریں گے۔ جہاں اختلافِ رائے کو برا سمجھنے کے بجائے اختلافِ رائے کا احترام پایا جاتا ہو، وہاں ذہنی جمود نہ ہوگا، بلکہ ایسے ماحول میں ذہنی ارتقا کا عمل جاری رہے گا اور ذہنی ارتقا بلاشبہ کسی انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

اختلاف، نفرت

مولانا محمود حسن دیو بندی (1851-1920) تحریکِ خلافت کے پر جوش حامیوں میں سے تھے۔ ان کے شاگرد مولانا اشرف علی تھانوی (1862-1943) تحریکِ خلافت کے مخالف تھے۔ وہ اس تحریک پر کھلم کھلا تنقید کرتے تھے۔ مگر استاد نے اپنے شاگرد کی اس "گستاخی" کو کبھی برا نہیں مانا۔ دونوں کے درمیان آخر وقت تک مخلصانہ تعلق باقی رہا۔

مولانا اشرف علی تھانوی ایک گفتگو کے ذیل میں اپنے استاد اور شیخ کے بارے میں لکھتے ہیں: "حضرت کے قلب پر میرے اختلاف سے ذرہ برابر بھی گرانی نہ تھی۔ ایک مرتبہ تحریک خلافت کے زمانہ میں حضرت کی بیٹھک میں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے میرے متعلق برے بھلے الفاظ کہہ رہے تھے۔ کچھ الفاظ حضرت کے کانوں میں پڑ گئے۔ باہر تشریف لے آئے۔ بہت خفا ہوئے اور یہ فرمایا کہ خبردار، جو آئندہ ایسے الفاظ کبھی استعمال کیے۔ اور یہ فرمایا کہ میرے پاس کیا وحی آتی ہے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ سب ٹھیک ہے۔ میری بھی ایک رائے ہے۔ اس کی بھی ایک رائے ہے۔ ایک مرتبہ حضرت نے یہ فرمایا کہ ہمیں تو اس پر فخر ہے کہ جو شخص تمام ہندستان سے بھی متاثر نہ ہوا اور کسی کی بھی پروا نہ کی وہ بھی ہماری ہی جماعت سے ہے"۔ (ملفوظات حکیم الامت، مولانا اشرف علی تھانوی، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، صفحہ 114)

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختلاف کے معاملہ میں علمائے امت کا طریقہ کیا ہونا چاہیے۔ اس طرح کے اختلافات میں وہی روح کارفرما ہونی چاہیے جو امام شافعی کی طرف منسوب اس قول میں بیان کیا گیا ہے: میری رائے درست ہے، مگر احتمالِ خطا کے ساتھ۔ دوسرے کی رائے غلط ہے مگر احتمالِ صحت کے ساتھ (رَأْيِي صَوابٌ يَحْتَمِلُ الخَطأَ، وَرَأْيُ غَيْرِي خَطأٌ يَحْتَمِلُ الصَّوَابَ)۔

یہ اختلافات عام طور پر اجتہادی امور میں ہوتے ہیں اور اجتہادی امور میں ہمیشہ ایک سے زیادہ رائے کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس لیے صحیح ترین مسلک یہ ہے کہ آدمی اختلاف کے باوجود اپنے آپ کو فریقِ ثانی کی نفرت سے بچائے۔ وہ اپنے نقطۂ نظر کو شدت کے ساتھ پیش کرے، اس کے باوجود اس کی نفسیات یہ ہو کہ یہ معاملہ 50-50 فیصد کا ہے، نہ کہ صد فی صد کا۔

اختلاف کے ساتھ اعتراف

مولانا حسین احمد مدنی (1879-1957) سیاسی مسلک کے اعتبار سے انڈین نیشنل کانگریس کے حامی تھے۔ مولانا اشرف علی تھانوی (1863-1943) کا مسلک اس معاملہ میں مختلف تھا۔ وہ کانگریس کی حمایت کو مسلمانوں کے لیے درست نہیں سمجھتے تھے۔ اس اختلاف کے باوجود دونوں بزرگوں میں نہایت اچھے تعلقات تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی قدر کرتے تھے۔

ایک شخص کا ذہنی سانچہ اگر یہ ہو کہ موقف صرف دو ہوا کرتے ہیں۔ یا کامل موافقت یا کامل مخالفت، تو وہ دونوں بزرگوں کے اس طریقہ کو ”زمانہ شناسی“ پر محمول کرے گا۔ وہ کہے گا کہ دونوں صاحبان اگرچہ ایک دوسرے کے مخالف تھے، مگر ذاتی مفاد کی بنا پر وہ ایک دوسرے کے بارے میں اچھے الفاظ بولتے رہے۔

مگر جو شخص اسلام کی روح اور مومنانہ مزاج کو جانتا ہو وہ اس کو وسعتِ نظری قرار دے گا۔ وہ کہے گا کہ دونوں صاحبان مخلص تھے۔ دونوں کا دین ایک تھا۔ البتہ بعض مسائل میں دونوں کی رائے ایک دوسرے سے الگ ہوگئی تھی۔ اور اس قسم کا اختلاف انسانوں کے درمیان ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ ہر دور کے مومنین صالحین میں اس قسم کا اختلاف پایا جاتا تھا اور ہمیشہ پایا جاتا رہے گا۔ یہ اختلاف بذات خود کوئی غیر محمود چیز نہیں۔ وہ غیر محمود صرف اس وقت بنتا ہے جب کہ اختلاف صرف اختلاف نہ رہے، وہ نفرت اور عناد تک جا پہنچے۔

اصحاب رسول کے درمیان بہت سے امور میں اختلاف تھا۔ اسی طرح فقہا اور علما میں اور مفسرین قرآن اور شارحین حدیث میں ہزاروں اختلاف پائے جاتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے اختلافات کا برملا اظہار کیا۔ اس کے باوجود ایسا ہوا کہ انھوں نے ایک دوسرے کا اعتراف کیا۔ وہ ہمیشہ ایک دوسرے کی قدر دانی کرتے رہے۔ اس دوطرفہ عمل کا سبب زمانہ شناسی نہیں تھی بلکہ دین شناسی تھی۔ ان کا یہ مسلک مفادِ دنیا کی بنا پر نہ تھا بلکہ خوفِ آخرت کی بنا پر تھا۔

اختلاف کے ساتھ اعتراف ایک آدمی کے مومنِ خاشع ہونے کی علامت ہے۔ لیکن بے خبر لوگوں کے لیے وہ مفاد پرستی اور زمانہ شناسی کے ہم معنی بن جاتا ہے۔

اختلاف کو بھلا دیا

گورباچوف (Mikhail Sergeyevich Gorbachev, 1931-2022) سوویت یونین کے آخری لیڈر تھے۔ وہ 1985 میں سوویت روس میں برسرِ اقتدار آئے۔ انھوں نے پارٹی میں اپنے موافق افراد لانے کے لیے اس کے ڈھانچے کو بدلنا شروع کیا۔ اس وقت بورس یلتسین (Boris Nikolayevich Yeltsin,1931-2007) پولٹ بیورو کے ممبر تھے۔ گورباچوف ان کی غیر معمولی شخصیت سے خائف تھے۔ اس لیے وہ یلتسین کو پولٹ بیورو میں شامل کرنے کے مخالف تھے۔ یہ اختلاف بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ 1987 میں یلتسین نے پارٹی کے تمام اعلیٰ عہدوں سے استعفادے دیا۔ 1989 میں یلتسین جمہوریہ روس کی صدارت کے لیے کھڑے ہوئے تو گورباچوف نے ان کی مخالفت کی۔ اور ان کے مقابلے میں دوسرا امیدوار کھڑا کیا۔ تاہم اس مخالفت کے باوجود یلتسین کامیاب ہوئے اور جمہوریہ روس کے صدر بن گئے (ہندوستان ٹائمس 26 اگست 1991)۔

روسی کمیونسٹ پارٹی کے انتہا پسند گروہ نے 19 اگست 1991 کو گورباچوف کے خلاف بغاوت کی اور ان کو ہٹا کر کریملن کی حکومت پر قابض ہو گئے۔ اس کا حوصلہ بھی ان کو اسی اختلاف سے ملا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یلتسین اور گورباچوف کے اختلاف سے فائدہ اٹھا کر وہ گورباچوف کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔ مگر عملاً اس کے برعکس صورتِ حال پیش آئی۔ بغاوت کے بعد یلتسین نے اپنے تمام اختلافات کو بھلا دیا۔ انھوں نے اپنی پوری طاقت اور اپنی ساری ذہانت گورباچوف کی حمایت پر لگا دی۔ اپنی ذات کو خطرے میں ڈال کر انھوں نے باغی حکمرانوں کے خلاف عوام کو منظم کیا۔ بغاوت کے اگلے ہی دن اس کے خلاف ماسکو میں اتنا بڑا عوامی مظاہرہ کرایا کہ باغیوں کو حکومت چھوڑ دینا پڑا۔ 21 اگست 1991 کو گورباچوف کریمیا سے واپس آ گئے اور دوبارہ حکومت کا عہدہ سنبھال لیا۔ عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ گورباچوف کا زندہ بچ جانا اور دوبارہ صدر کے عہدہ پر واپس آجانا یلتسین کا کارنامہ ہے۔

بلند فطرت آدمی کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے۔ مشکل وقت میں وہ شکایت اور اختلاف کو بھلا کر انسان کا ساتھ دیتا ہے۔ جبکہ پست فطرت آدمی کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔

اختلاف ایک آزمائش

اختلاف ایک پرچۂ امتحان ہے۔ کسی سے آپ کا اختلاف پیدا ہو جائے تو سمجھ لیجیے کہ اللہ نے آپ کو ایک نازک آزمائش میں ڈال دیا تا کہ یہ جانے کہ آپ سچے مومن ہیں یا سچے مومن نہیں ہیں۔ اختلاف کو اختلاف کے دائرے میں رکھنا سچے اہل ایمان کا طریقہ ہے۔ جو لوگ اختلاف کو تخریب کاری کے درجے تک پہنچا دیں وہ بلا شبہ ایمان و اسلام کے دائرے سے نکل گئے۔

آدمی جب اختلاف کو اختلاف کے دائرے میں رکھے تو اس کا امکان ہوتا ہے کہ تبادلۂ خیال کے دوران دونوں میں سے کسی کے اوپر سچائی کھل جائے اور اس طرح جو بھٹکے ہوئے مسافر کی مانند تھا وہ دوبارہ صحیح راستہ پر آجائے۔ مگر جب ایک آدمی اختلاف کو تخریب کاری تک پہنچا دے تو اس کے بعد گمراہی کے گڑھے میں گرنے کے سوا کوئی انجام اس کے لیے باقی نہیں رہتا۔ ایسے آدمی کا دماغ منفی سوچ کا کارخانہ بن جاتا ہے۔ وہ دلیل اور الزام تراشی کے فرق کو سمجھنے کی اہلیت کھو دیتا ہے۔ وہ منصفانہ اختلاف کی حد سے گزر کر ظالمانہ اختلاف کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہ خدا کی پکڑ کے احساس سے غافل ہو جاتا ہے۔ وہ صرف اپنی انا (ego) کو رہنما بنا لیتا ہے۔ اب اس کا مقصد حق کو قائم کرنا نہیں ہوتا بلکہ صرف اپنی ذات کو قائم کرنا اس کا اول و آخر مقصد بن جاتا ہے۔ وہ خدا کی رحمت سے دور ہو کر پوری طرح شیطان کی گرفت میں آجاتا ہے۔

اختلاف پیدا ہونا بالکل فطری ہے۔ مگر اختلاف کو تخریب کاری بنانا سراسر ظالمانہ فعل ہے۔ جو لوگ اختلاف کو تخریب کاری بنائیں ان کے لیے سخت خطرہ ہے کہ وہ خدا کی شدید پکڑ میں آجائیں۔ عین ممکن ہے کہ آخرت میں ان سے کہہ دیا جائے کہ آج تم نے دنیا کی زندگی میں شیطان کو اپنا رہنما بنایا۔ اب آخرت کی خدائی نعمتوں میں تمہارا کوئی حصہ نہیں۔

اختلاف کے وقت عدل پر قائم رہنا آدمی کے لیے جنت کا دروازہ کھولتا ہے، اور اختلاف کے وقت عدل و انصاف سے ہٹ جانا آدمی کو جہنم کے دروازے پر پہنچا دیتا ہے۔

(اِس شمارے کے اردو مضامین اختلافِ رائے کے موضوع پر
زیرِ اشاعت نئی کتاب کے مضامین پر مشتمل ہیں)

विकास के तीन स्तर

एक हदीस अलग अलग किताबों में आई है। *मुसनद इमाम अहमद* में इसके शब्द इस प्रकार हैं: हज़रत अबू हुरैरा (रज़ियल्लाहु अन्हु) से वर्णन है कि पैगंबर-ए-इस्लाम ने कहा:

> "मनुष्य धातु की तरह हैं, जैसे सोने और चांदी की धातु। जो व्यक्ति जिहालत (अज्ञानता) में बेहतर था, वही इस्लाम में भी बेहतर है, बशर्ते वह समझ हासिल कर ले।" (मुसनद अहमद, हदीस संख्या 10956)

इस हदीस में इंसान के बौद्धिक विकास के चरणों को बताया गया है। पहला चरण वह है जिसमें इंसान जन्म लेता है। दूसरा चरण वह है जो इंसान अपने प्रयासों से बनाता है। तीसरा चरण मारिफ़त (ज्ञान) का है। जब इंसान मारिफ़त के चरण में पहुंचता है, तो वह अपने विकास की अंतिम मंज़िल पर पहुंच जाता है, जिसे इस्लाम कहा गया है।

इंसान की स्थिति धातु (मेटल) जैसी है। जैसे लोहा जमीन से निकलता है। प्रारंभिक स्थिति में वह कच्चा लोहा (ore) होता है। इसके बाद उसे पिघलाकर साफ किया जाता है और वह स्टील बन जाता है। फिर वह वह बनाने के मुख्तलिफ़ मरहले से गुजरता है और अंततः एक मशीन का रूप ले लेता है। यानी पहले चरण में कच्चा लोहा, दूसरे चरण में स्टील, और तीसरे और अंतिम चरण में मशीन।

इंसान भी ऐसा ही है। जब वह पैदा होता है, तो वह प्रकृति की खदान से बाहर आता है। इसके बाद वह बड़ा होता है और अपनी सोच को क्रियान्वित करता है। वह शिक्षा और प्रशिक्षण के चरणों से गुजरता है। इस प्रकार परिपक्वता की

आयु में पहुंचकर वह एक संपूर्ण व्यक्ति बन जाता है। यह इंसानी जीवन का मध्य चरण है। इसके बाद यदि वह अपनी अक़्ल को सही दिशा में उपयोग करे, तो वह मारिफ़त-ए-हक़ के चरण में पहुंच जाता है। यह वह चरण है, जहां इंसान कमाल-ए-इंसानियत के स्तर पर पहुंचकर ईश्वर का ज्ञान (आ'रिफ़ बिल्लाह) प्राप्त करता है।

इन तीन चरणों को इस प्रकार वर्णित किया जा सकता है:

1. जन्मजात व्यक्तित्व (Born Personality)
2. विकसित व्यक्तित्व (Developed Personality)
3. ज्ञानी व्यक्तित्व (Realized Personality)

जन्मजात व्यक्तित्व ईश्वर का दिया हुआ व्याक्तितिव होता है। इस दृष्टि से सभी मनुष्य समान हैं। क्षमता के मामले में एक व्यक्ति और दूसरे व्यक्ति में हमेशा अंतर होता है, लेकिन संभावित योग्यता (Potential Capacity) के संदर्भ में सभी मनुष्य समान होते हैं।

इसी तथ्य को एक हदीस में इस प्रकार व्यक्त किया गया है:

> "ताक़तवर ईमान वाला ईश्वर के निकट कमजोर ईमान वाले से बेहतर और अधिक प्रिय है, और हर किसी में भलाई है। जो चीज़ तुम्हारे लिए फायदेमंद हो, उसे प्राप्त करने की कोशिश करो और ईश्वर से मदद मांगो, लेकिन हार मत मानो। और अगर तुम्हारे खिलाफ कोई बात पेश आए तो यह न कहो कि काश, मैंने ऐसा और ऐसा किया होता। बल्कि यह कहो कि यह अल्लाह का तक़दीरी योजना था, उसी ने जो चाहा किया। क्योंकि ''अगर'' कहना शैतान के काम का दरवाजा खोलता

है।” (सहीह मुस्लिम, हदीस संख्या 2664)

इस हदीस में ईमान वाले से मुराद इंसान है। इसका मतलब यह है कि कोई इंसान अगर अपने अंदर किसी एक पहलू से कमी महसूस करे तो उसे मायूस नहीं होना चाहिए, क्योंकि दूसरे पहलू से उसके अंदर कोई और गुण अधिक होगा। इंसान को चाहिए कि वह उस छमता (potential) को पहचाने जो उस को ख़ुदा की की तरफ़ से मिली हुई है और हिम्मत के साथ अपनी ज़िंदगी की रचना करे। जीवन के संघर्ष के दौरान अगर उसे कोई नुकसान पहुँचे तो उसे यकीन रखना चाहिए कि इस नकारात्मक अनुभव में भी कोई सकारात्मक लाभ छुपा होगा। इंसान को चाहिए कि वह अपने हर नकारात्मक अनुभव से सकारात्मक सीख ले और किसी भी हाल में हिम्मत न हारे।

इस तरह आदमी अपनी शख्सियत का निर्माण करता रहता है। वह अपना मूल्यांकन करके अपनी कंडीशनिंग को दूर करता रहता है। वह अपने चेतना को जागरूक करके अपने अंदर ऐसी शख्सियत का विकास करता रहता है जिसमें सत्य को स्वीकार करने की योग्यता मौजूद हो, जिसमें वह क्षमता हो जिसे पैगंबर की एक दुआ में इस तरह व्यक्त किया गया है:

> "हे अल्लाह, तू मुझे सत्य को सत्य के रूप में दिखा और उसकी अनुगति करने की शक्ति दे। और हे अल्लाह, तू मुझे असत्य को असत्य के रूप में दिखा और उससे बचने की शक्ति प्रदान कर। और हे अल्लाह, तू मुझे चीजों को वैसा ही दिखा जैसा कि वे वास्तव में हैं।" (तफसीर इबन कसीर, भाग 1, पृष्ठ 427; तफसीर अल-राज़ी, भाग 1, पृष्ठ 119)

यही वह इंसान है जिसे हमने ऊपर की व्याख्या में विकसित व्यक्तित्व

(developed personality) कहा है। वही आदमी बुद्धिमान होता है जो अपने अंदर इस तरह के व्यक्तित्व का निर्माण करे। जहाँ तक प्राकृतिक अस्तित्व की बात है, हर इंसान को प्राकृतिक अस्तित्व का उपहार ईश्वर की ओर से समान रूप से मिलता है, लेकिन उसके बाद स्वयं को एक विकसित व्यक्तित्व बनाना, यह हर इंसान का स्वयं का प्रयास होता है। ठीक उसी तरह जैसे कच्चा लोहा प्रकृति की ओर से प्रदान किया जाता है, लेकिन इस कच्चे लोहे को स्टील और मशीन में बदलने की प्रक्रिया इंसानी कारखाने में होती है।

इसी आत्म-तैयारी (self-preparation) की प्रक्रिया पर अगले विकास के चरण की निर्भरता होती है। जो लोग स्वयं को पहचानें, जो लोग अपने कर्मों का ईमानदारी से मूल्यांकन करें, जो लोग अपनी कमियों को खोजकर अपने अंदर सुधार करें, जो लोग हर कीमत चुकाकर अपने "कच्चे लोहे" को "स्टील" बनाने का काम करें, जिन लोगों की यह स्थिति हो कि वे अहंकार, घमंड, लालच, जलन, गुस्सा और बदले की भावना जैसे नकारात्मक भावों का कभी शिकार न बनें, जो कि व्यक्तित्व के विकास में एक घातक बाधा की तरह होते हैं। संक्षेप में, जो लोग लगातार अपने ऊपर आत्म-शुद्धि (purification) की प्रक्रिया जारी रखें, वही लोग होते हैं जो ईश्वर की कृपा से सत्य को खोजते हैं और उसे पूरी तत्परता से स्वीकार कर लेते हैं।

"तजकिया" शब्द का शाब्दिक अर्थ है, पवित्र करना (purification)। यह हर इंसान की ज़रूरी आवश्यकता है। यह हर इंसान की समस्या है कि वह अपने माहौल का असर लेता है, जिसे मानसिक जकड़न (conditioning of mind) कहा जाता है। अपनी भावनाओं और इच्छाओं के अनुसार, उसकी कुछ आदतें बन जाती हैं। अपने स्वार्थ और लाभ के प्रभाव में, सचेत या अचेत रूप से, उसका अपना एक स्वभाव बन जाता है। ये सभी चीजें इंसान की आध्यात्मिक

प्रगति में बाधा डालती हैं। इन बाधाओं को दूर करने के लिए इंसान को स्वयं का पहरेदार (guard) बनना पड़ता है। वह खोज-खोज कर अपनी गलतियों को सुधारता है। वह एक कठोर आत्म-सुधार (merciless deconditioning) की प्रक्रिया को अपनाता है। यही तजकिया की अनिवार्य शर्त है। इसके बिना किसी का वास्तविक तजकिया नहीं हो सकता— कठोर आत्म-सुधार के बिना तजकिया नहीं, और तजकिया के बिना जन्नत नहीं।

जो लोग स्वयं को इन चरणों से गुजारें और अपनी तैयारी के नतीजे में सत्य को प्राप्त करें, उन्हें ही कुरआन में "अन-नफ्स अल-मुतमइनना" (अल-फज्र: 27) कहा गया है। ये वे लोग हैं जो ईश्वर की सृजनात्मक योजना से संतुष्ट हुए, जिन्होंने ख़ुद को इस योजना में ढालकर अपने अंदर वांछित व्यक्तित्व का निर्माण किया। यही वे लोग हैं जो ईश्वर की प्रसन्नता प्राप्त करेंगे और ईश्वर की कृपा से जन्नत के अनंत बागों में बसाए जाएँगे।

सब कुछ ईश्वर का उपहार

अरब में जब तेल की दौलत आई, तो वहां अचानक जीवन का नक्शा बदल गया। एक अरब शेख, जो पहले एक साधारण तंबू में रहता था और जिसकी पूरी जिंदगी ऊंट पर निर्भर थी, अचानक तेल की दौलत से ख़ुशहाल हो गया। उसके एक दोस्त ने स्विट्ज़रलैंड में उसके लिए आधुनिक शैली का एक शानदार मकान खरीदा। जब वह अरब शेख जहाज़ से सफर करके वहां पहुंचा और अपने खूबसूरत मकान को देखा, तो उसे यक़ीन ही नहीं हुआ कि यह मकान उसी का है। उसे ऐसा महसूस हुआ जैसे वह कोई सपना देख रहा हो।

वह अपने मकान की दीवारों और उसके फर्नीचर को छू-छूकर देखता रहा कि

यह सच में उसका मकान है या वह सपने में किसी काल्पनिक महल को देख रहा है। बहुत देर बाद, जब उसे यकीन हुआ कि यह एक वास्तविक मकान है और वह उसी का है, तो वह खुशी के आंसुओं के साथ सजदे में गिर पड़ा और काफी देर तक इसी हालत में रहा।

यह जो अनुभव एक अरब शेख ने किया, वैसा ही अनुभव हर इंसान को एक बड़े पैमाने पर करना चाहिए। क्योंकि इस दुनिया के रूप में हर इंसान को वही मिला हुआ है, जो उस अरब शेख को स्विट्ज़रलैंड के मकान के रूप में मिला। स्विट्ज़रलैंड का मकान उस अरब शेख के लिए जितना अद्भुत था, उससे अनगिनत गुना ज्यादा अद्भुत यह सृष्टि है, जो हर इंसान को बिना किसी कीमत के हर पल मिल रही है।

हर इंसान का मामला, बढ़े हुए स्वरूप के साथ, उसी अरब शेख के मामले जैसा है। सच तो यह है कि हर इंसान पूरी तरह से एक असहाय और वंचित प्राणी है। फिर उसे इस दुनिया के रूप में सब कुछ दिया गया है। प्रकृति अपने समस्त खजानों के साथ जीवनभर उसकी सेवा में लगी रहती है।

इंसान का जन्म होना ही अपने आप में एक चमत्कार है। यदि इंसान इस पर विचार करे, तो वह एक-एक चीज़ पर आश्चर्यचकित हो जाएगा। एक ऐसा प्राणी जो जीवित है, जो देख और सुन सकता है, जो सोचता है और चलता है, जो योजना बनाता है और उसे अपने मनमुताबिक क्रियान्वित करता है। ये सभी इतनी अनूठी विशेषताएं हैं, जो इंसान को मुफ्त में मिली हुई हैं। यदि इंसान इस पर गहराई से सोचे, तो वह कृतज्ञता के भाव में डूब जाएगा।

फिर यह दुनिया, जिसमें इंसान रहता है, इतनी अद्भुत है कि यह पूरी तरह से इंसान के अनुकूल है। पृथ्वी जैसा ग्रह इस विशाल ब्रह्मांड में दूसरा नहीं है। यहां पानी

है, हरियाली है, हवा है, धूप है, खाने का सामान है, और अनगिनत चीजें हैं, जो सृष्टिकर्ता के एकतरफा उपहार के रूप में यहां मौजूद हैं। ये चीजें पृथ्वी के अलावा कहीं और नहीं पाई जातीं।

यदि कोई व्यक्ति इस सच्चाई पर विचार करे, तो वह भी उस अरब शेख की तरह कृतज्ञता के भाव से सजदे में गिर पड़े। लेकिन ऐसा नहीं होता। इसका कारण यह है कि इंसान दुनिया की चीजों को *फॉर ग्रांटेड* मान लेता है। वह जानबूझकर या अनजाने में यह समझता है कि जो कुछ है, वह होना ही चाहिए। जो कुछ उसे मिला हुआ है, वह उसे मिलना ही चाहिए। यही वह जगह है, जहां इंसान की परीक्षा है।

इंसान को चाहिए कि वह इस मामले में अपनी चेतना को जागृत करे। बार-बार विचार करके इस सच्चाई को समझे कि वह सिर से पैर तक एक असहाय प्राणी है। उसे जो कुछ मिला है, वह पूरी तरह से ईश्वर की देन है। यदि ईश्वर न दे, तो उसे कुछ भी नहीं मिलेगा। जो चीजें इंसान को अपने आप मिलती हुई प्रतीत होती हैं, उन्हें वह इस तरह ले, जैसे वे हर समय सीधे ईश्वर की ओर से भेजी जा रही हों। वह मिली हुई चीजों को ईश्वर की देन के रूप में पहचानने की कोशिश करे।

ईश्वर को वही इंसान प्रिय है, जो अपनी चेतना को इतना जागृत करे कि वह सामान्य रूप से मिलने वाली जीवन की चीजों को ईश्वर की असामान्य कृपा के रूप में देखे। वह सामान्य (Usual) को असामान्य (Unusual) के रूप में समझे। वह परोक्ष (अदृश्य) को प्रत्यक्ष के रूप में अनुभव करे। ऐसे ही लोग हैं, जिन्हें आख़िरत में ईश्वर का दर्शन प्राप्त होगा। यही वे लोग हैं, जिन्हें ईश्वर के पड़ोस में बनी हुई अनंत स्वर्ग में स्थान दिया जाएगा।

जन्नत की कीमत

जन्नत अनंत सुखों की दुनिया है। वे कौन लोग हैं जो मृत्यु के बाद इस योग्य ठहरेंगे कि जन्नत की श्रेष्ठ दुनिया में जगह हासिल कर सकें? यह वही लोग होंगे, जिन्होंने मौत से पहले की अपनी जिंदगी में, विचार और कर्म के स्तर पर, खुद को जन्नत जैसी उच्चस्तरीय दुनिया में रहने के योग्य बनाया होगा।

यह एक बड़ी भूल होगी यदि जन्नत की कीमत किसी और चीज को समझ लिया जाए। उदाहरण के लिए, यह मान लेना कि किसी बुज़ुर्ग का दामन पकड़ने से जन्नत मिल जाएगी; या किसी खास समूह से जुड़ जाना, कुछ औपचारिक कर्म कर लेना, किसी पवित्र स्थान की यात्रा कर लेना, धर्म के नाम पर दिखावा करना, स्टेज पर खड़े होकर हम्द और नात के गीत गाना, औ़राद और वज़ीफों में व्यस्त रहना, धर्म के नाम पर भव्य इमारतें बनाना, जलसे और जुलूसों का आयोजन करना, इस्लाम को केवल अपने गर्व का विषय बना लेना—इनमें से किसी चीज़ का जन्नत से कोई संबंध नहीं है। ऐसी कोई भी चीज़ किसी इंसान को हरगिज़ जन्नत में नहीं ले जा सकती।

जन्नत में केवल वही लोग प्रवेश करेंगे, जो जन्नती व्यक्तित्व लेकर वहां पहुंचेंगे। क़ुरआन में जन्नती व्यक्तित्व को *तज़किया याफ्ता शख्सियत* (purified personality) कहा गया है (सूरह ताहा: 76)। जन्नती व्यक्तित्व वही है, जो जन्नत की आवश्यकताओं के अनुरूप एक तैयार शख्सियत (prepared personality) हो। इस व्यक्तित्व की तैयारी इसी दुनिया में होती है।

मौजूदा दुनिया में विभिन्न परिस्थितियों और अनुभवों के दौरान इंसान खुद को एक पवित्र और सकारात्मक व्यक्तित्व बनाता है। वह खुद को नकारात्मक भावनाओं से बचाकर सकारात्मक स्वभाव वाला बनाए रखता है। मुख़ालिफ़

हालात के बावजूद वह सिद्धांतों पर कायम रहता है। वह कभी अन्याय का सहारा नहीं लेता। वह अपनी इच्छाओं पर नियंत्रण रखता है। वह अपनी स्वतंत्रता का गलत उपयोग करने से बचता है। वह बिना किसी दबाव के दूसरों के अधिकारों का पालन करता है। वह हमेशा सच बोलता है। वह किए हुए वादों को पूरा करता है। न तो कोई असफलता उसे निराश करती है और न कोई सफलता उसे अहंकारी बनाती है।

यही जन्नती व्यक्तित्व है, और ऐसे ही लोग जन्नत के बागों में स्थान पाएंगे।

कुछ आदर्श महिलाएँ

इतिहास में कुछ ऐसी महिलाएँ रही हैं, जिन्हें दूसरों के लिए आदर्श माना जा सकता है। इन महिलाओं में से कुछ का संक्षिप्त उल्लेख यहाँ किया जा रहा है।

हज़रत हाजरा- हज़रत इस्माईल की माँ

इन महिलाओं में से एक हाजरा (इस्माईल की माँ) हैं, जो पैगंबर इब्राहीम (अलैहिस्सलाम) की पत्नी थीं। उनका समय लगभग चार हजार साल पहले का है। अल्लाह के आदेश के अनुसार, पैगंबर इब्राहीम ने यह योजना बनाई कि अरब के रेगिस्तान के प्राकृतिक माहौल में एक नई पीढ़ी तैयार की जाए, जो मूर्तिपूजा और उसके प्रभाव से मुक्त हो। इस उद्देश्य के लिए एक महिला की महान कुर्बानी की आवश्यकता थी, और हाजरा (ह. इस्माईल की मां) ने यह कुर्बानी दी। वे मक्का के निर्जन और बंजर रेगिस्तान में अपने बच्चे के साथ बस गईं।

यह एक अत्यंत धैर्यपूर्ण और कठिन कार्य था। यह एक प्रकार से मृत्यु जैसे हालात में जीवन तलाशने के समान था। जब पैगंबर इब्राहीम ने उन्हें बताया कि यह अल्लाह का आदेश है, तो हाजरा ने विश्वास के साथ कहा, "फिर तो अल्लाह

हमें व्यर्थ नहीं जाने देगा (إِذَنْ لَا يُضِيعُنَا)"

(सहीह अल-बुखारी, हदीस संख्या 3364)।

इतिहास इस बात की गवाही देता है कि ऐसा ही हुआ। उनकी संतान से एक ऐसी कौम उत्पन्न हुई, जिसे एक पश्चिमी लेखक ने "नायकों की कौम" (A Nation of Heroes) कहा है।

इस घटना में सभी महिलाओं के लिए एक महान सबक है:

यदि वे अल्लाह पर भरोसा रखकर किसी नेक काम के लिए आगे बढ़ें, तो निश्चित रूप से उन्हें अल्लाह की मदद मिलेगी। नेक काम के लिए दी गई उनकी कुर्बानी कभी व्यर्थ नहीं जाएगी, बल्कि वह हमेशा फलदायी होगी।

हज़रत आसिया बिन्ते मुज़ाहिम

इसी प्रकार की एक मिसाल आसिया बिन्ते मुज़ाहिम की है। उनका समय लगभग साढ़े तीन हजार साल पहले का है। उसी समय पैगंबर मूसा (अलैहिस्सलाम) का आगमन हुआ। उस समय फिरऔन मिस्र का राजा था। फिरऔन पैगंबर मूसा का सख्त दुश्मन बन गया। लेकिन फिरऔन की पत्नी आसिया बिन्ते मुज़ाहिम, पैगंबर मूसा के तौहीद (एकेश्वरवाद) के संदेश से प्रभावित हुईं और उन पर ईमान ले आईं।

इस पर फिरऔन बेहद नाराज हुआ और आसिया को मौत की सज़ा देने का हुक्म दिया। आसिया बिन्ते मुज़ाहिम ने मौत को कुबूल कर लिया, लेकिन तौहीद (एकेश्वरवाद) के धर्म को छोड़ने पर रज़ामंद नहीं हुईं। यह उनके लिए एक महान कुर्बानी का अमल था। उनकी इस कुर्बानी के कारण अल्लाह ने उनके ईमान को स्वीकार कर लिया। उस समय उनकी ज़ुबान से यह दुआ निकली:

رَبِّ ابْنِ لِي عِندَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِي مِن فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهِ وَنَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ.

"ऐ मेरे रब, मेरे लिए अपने पास जन्नत में एक घर बना दे और मुझे फ़िरऔन और उसके कर्मो से छुटकारा दे और मुझे ज़ालिम क़ौम से मुक्ति प्रदान कर।" (क़ुरान, 66:11)

यह दुआ *इस्म-ए-आज़म* (ईश्वर के सर्वोच्च नाम) के साथ की गई थी, जो उसी समय कबूल कर ली गई। इस घटना से यह सीख मिलती है कि यदि कोई महिला (या पुरुष) आसिया जैसी कुर्बानी का उदाहरण पेश करे, तो उसे *इस्म-ए-आज़म* के साथ दुआ करने की तौफीक़ (सामर्थ्य) मिलती है और ऐसी दुआ को निश्चित रूप से स्वीकार किया जाता है।

हज़रत मरियम, हज़रत मसीह की माँ

ऐसी ही एक मिसाल हज़रत मरियम की है, जो पैगंबर हज़रत मसीह (अलैहिस्सलाम) की माँ थीं। उनका समय लगभग ढाई हज़ार साल पहले का है। उन्होंने अपनी पूरी जिंदगी को पूरी तरह से अल्लाह के काम और उसके ज़िक्र व दुआ के लिए समर्पित कर दिया था। इस समर्पण के फलस्वरूप, उन्हें अल्लाह की तरफ़ से यह विशेष इनाम मिला कि उनके लिए *ख़ुदाई रिज़्क़* (सूरह आले इमरान: 37) आने लगा।

'*ख़ुदाई रिज़्क़*' का क्या मतलब है? यह अल्लाह की तरफ़ से दी जाने वाली आत्मिक खुराक (spiritual food) है। यह दिव्य दृष्टि (Divine Grace) है, जो वह अपने से करीब होने वाले बंदों को देता है। ऐसी महिलाएं (या पुरुष) उच्च आध्यात्मिक अवस्थाओं में जीने लगते हैं। उन्हें वह चीज़ प्रदान की जाती है, जिसे रब्बानी हिकमत (Divine Wisdom) कहा जाता है। ऐसे लोग

अल्लाह के खास वहियों (दिव्य संदेश) का केंद्र बन जाते हैं।

अल्लाह की यह विशेष रहमत, जो हज़रत मरियम को हासिल हुई, इसका दरवाज़ा हर महिला और पुरुष के लिए खुला है, बशर्ते कि वे उसी इख़लास (सच्चाई और समर्पण) का सुबूत दें, जैसा हज़रत मरियम ने दिया था।

हज़रत खदीजा बिन्ते ख़ुवैलिद

इसी प्रकार की एक और मिसाल हज़रत खदीजा बिन्ते ख़ुवैलिद (वफ़ात: 620 ईस्वी) की है। वे पैगंबर-ए-इस्लाम की पहली पत्नी थीं। उन्हें यह विशेष दर्जा प्राप्त है कि उन्होंने सबसे पहले पैगंबर-ए-इस्लाम के संदेश को कुबूल किया।

मक्का का दौर पैगंबर-ए-इस्लाम के लिए अत्यधिक कठिनाई और मुसीबत का दौर था। इस पूरी अवधि में, हज़रत खदीजा ने खुले दिल से उनका साथ दिया। पैगंबर-ए-इस्लाम से निकाह के बाद उन्हें कई कठिनाइयों का सामना करना पड़ा, लेकिन उन्होंने कभी भी किसी शिकायत का इज़हार नहीं किया। वे हर हाल में सब्र और शुक्र की मिसाल बनी रहीं।

रिवायत में आता है कि एक दिन हज़रत जिब्राइल उनके घर आए। पैगंबर-ए-इस्लाम ने जिब्राइल को देखा, लेकिन हज़रत खदीजा ने नहीं देखा। पैगंबर-ए-इस्लाम ने उनसे कहा कि यह जिब्राइल हैं, और वे तुम्हें अल्लाह की तरफ़ से सलाम पहुंचाने आए हैं।

हज़रत जिब्राइल ने उन्हें यह खुशखबरी दी कि जन्नत में तुम्हारे लिए एक खूबसूरत घर तैयार है, जहां न कोई शोर होगा और न कोई तकलीफ (لاَ صَخَبَ فِيهِ، وَلاَ نَصَبَ) सहीह अल-बुख़ारी, हदीस संख्या 3820।

हज़रत खदीजा को इसी दुनिया में जन्नत की खुशखबरी दी गई। यह घटना किसी अपवाद (exception) को नहीं, बल्कि एक आदर्श (example) को पेश करती है। हज़रत खदीजा के ज़रिए इतिहास में यह मिसाल कायम हुई कि जो महिला (या पुरुष) हज़रत खदीजा की तरह सब्र और शुक्र का प्रमाण दे, उन पर अल्लाह के फ़रिश्ते उतरेंगे और इसी दुनिया में उन्हें यह बशारत देंगे कि अगले जीवन में उनके लिए जन्नत, यानी खुशियों और सुकून की अनंत दुनिया तैयार है।

हज़रत आइशा बिन्ते अबू बक्र

इसी प्रकार की एक और मिसाल आइशा बिन्ते अबू बक्र अस्सिद्दीक़ (वफ़ात: 678 ईस्वी) की है। वे पैगंबर-ए-इस्लाम की पत्नी थीं। पैगंबर-ए-इस्लाम की वफ़ात के बाद वे लगभग पचास साल तक जीवित रहीं। इस दौरान उन्होंने इस्लाम की हिकमत और ज्ञानभरे संदेश को लोगों तक पहुँचाना जारी रखा। उस समय लिखित रिकॉर्ड नहीं होते थे, इसलिए वे पैगंबर की शिक्षाओं का एक जीवंत प्रमाण बनी रहीं। इस्लामी शिक्षा की समझ उनमें इतनी गहरी थी कि पैगंबर के साथी भी दूर-दूर से आकर उनसे धर्म का ज्ञान लिया करते थे।

हज़रत आइशा की जिंदगी हर महिला के लिए एक बेहतरीन आदर्श है। उन्होंने बहुत ही साधारण और सादा जीवन जिया। सांसारिक चीजों और आर्थिक मामलों में उन्होंने संतोष (क़नाअत) को अपनाया। इसी सादगी ने उन्हें यह मौका दिया कि वे पैगंबर-ए-इस्लाम की संगत से पूरा लाभ उठा सकें। उन्होंने अपना जीवन पूरी तरह से दीन का ज्ञान सीखने और समझने में लगा दिया। उनके इसी समर्पण की वजह से, पैगंबर की वफ़ात के बाद भी वे लंबे समय तक लोगों को धर्म की शिक्षा देती रहीं।

यह अवसर हर महिला के लिए खुला है। अगर वे सादा जीवन अपनाएँ और खुद को दीन का ज्ञान सीखने में समर्पित करें, तो उन्हें भी अल्लाह की मदद मिलेगी। इस तरह वे भी अपने समय में लोगों के लिए वही रहमत और मार्गदर्शक बन सकती हैं, जो हज़रत आइशा इसलाम के प्रारंभिक दौर में बनीं।

मौत: एक अनुस्मारक (Reminder)

मौत मरने वाले के लिए इस दुनिया से एक अंत होता है, लेकिन जीवित लोगों के लिए यह एक याद दिलाने वाला संदेश है। जब कोई मरता है, तो देखने में यह बस एक आवाज़ के खामोश हो जाने जैसा लगता है। मगर उस खामोशी में एक गहरा संदेश छिपा होता है— "जो समय उस पर आया, वही एक दिन हमारे ऊपर भी आएगा। अपने उस समय के लिए हमें तैयार रहना है।"

यह आम बात है कि जब किसी की उम्र का एक साल पूरा होता है, तो उसका जन्मदिन मनाया जाता है। लेकिन अगर गहराई से देखें, तो यह दिन हमें याद दिलाता है कि हमारी ज़िंदगी का एक और साल कम हो गया है और हम अपनी मृत्यु के एक कदम और क़रीब आ गए हैं।

वास्तविकता यह है कि हर इंसान की उम्र हर पल घट रही है। हर जन्मदिन यह बताता है कि तुम्हारी ज़िंदगी का एक और साल कम हो गया। मौत, दरअसल, इसी घटती हुई उम्र की अंतिम सीमा है।

लोग अपने जन्मदिन को खुशी के मौके के रूप में मनाते हैं, लेकिन अगर हम गहराई से सोचें, तो सच्चाई इसके बिल्कुल विपरीत है। हर नया जन्मदिन यह याद दिलाता है कि मौत और यौम-ए-हिसाब (न्याय का दिन) अब और करीब

आ गया है। आख़िरत की तैयारी के लिए तुम्हारे पास एक साल और कम हो गया है।

मौत के दो पहलू होते हैं। एक यह कि व्यक्ति इस दुनिया से चला जाता है। दूसरा यह कि वह अपनी तमाम इच्छाओं को अधूरा छोड़कर जाता है। यह इस बात का इशारा है कि यह दुनिया इच्छाओं को पूरा करने की जगह नहीं है। सच्ची और पूरी संतुष्टि केवल अगली दुनिया में ही संभव है।

बुद्धिमान वह है, जो इस संकेत को समझे और वर्तमान जीवन को एक तैयारी का चरण मानते हुए खुद को अगली दुनिया के योग्य बनाए। जीवन कर्म का एक चरण है और मृत्यु अल्लाह की अदालत में पेशी का समय। यह हर व्यक्ति के लिए अत्यंत गंभीर मामला है। समझदार वही है, जो इस मामले को समझे और इसे अपनी सबसे बड़ी चिंता (Supreme Concern) बनाए।

शुक्र: एक कुर्बानी का अमल

शुक्र (कृतज्ञता) सबसे बड़ी इबादत है। यह जन्नत की कीमत है, क्योंकि बिना शुक्र के ईमान अधूरा होता है। अगर दिल में कृतज्ञता नहीं है, तो अल्लाह की सच्ची इबादत मुमकिन नहीं।

शुक्र हमें उन ऊँचे आध्यात्मिक एहसासों तक पहुँचने में मदद करता है, जिन्हें क़ुरआन में "रब्बानियत" (आले इमरान: 79) कहा गया है। इसका मतलब है, अल्लाह से गहरा जुड़ाव और आध्यात्मिक समझ।

असल में, दीनदारी की बुनियाद शुक्र है। अगर इंसान दिल से शुक्रगुज़ार नहीं, तो उसकी दीनदारी सिर्फ दिखावे की होती है, जैसे किसी फल का केवल छिलका, जिसमें अंदर का असली गूदा नहीं होता।

लेकिन शुक्र का मतलब सिर्फ ज़ुबान से "अल्हम्दुलिल्लाह" कहना नहीं है। असली शुक्र तब होता है जब इंसान अल्लाह की दी हुई नेमतों को मानकर, उन्हें सही जगह पर इस्तेमाल करे और जरूरत पड़ने पर कुर्बानी देने के लिए तैयार रहे।

सच्चा शुक्र वही महसूस कर सकता है, जो अपने समय, संसाधन, और इच्छाओं को अल्लाह को राज़ी करने के लिए समर्पित करने का हौसला रखता है। यही वह कृतज्ञता है जो अल्लाह को सबसे ज़्यादा पसंद है।

असल में, इस दुनिया में हर इंसान किसी न किसी रूप में यह महसूस करता है कि उसे कुछ न कुछ कम मिला है। हर किसी के दिल में कहीं न कहीं शिकायतें या नकारात्मक भावनाएँ छिपी रहती हैं। लोग अक्सर दूसरों से असंतुष्ट रहते हैं और नफरत या नाराज़गी के माहौल में जीने लगते हैं। यही वह स्थिति है, जो इंसान के लिए सच्चा शुक्र (कृतज्ञता) करना सबसे ज़्यादा मुश्किल बना देती है।

कई बार इंसान ज़ुबान से "शुक्र है" कहता है, लेकिन उसके दिल में कृतज्ञता का सच्चा एहसास नहीं होता। उसका मन शिकायतों से भरा रहता है, और वह अपनी मिली नेमतों को भूल जाता है।

ऐसे माहौल में सच्चा शुक्र वही इंसान कर सकता है, जो अपनी सोच को इतना जागरूक बनाए कि नकारात्मक हालात के बावजूद शुक्र करने का जज़्बा रखे। वह नफरत और शिकायतों के अंधेरे में भी उम्मीद और संतोष की रोशनी जलाए रखे। उसे चाहिए कि वह अपने दिल से शिकायतों और नकारात्मकता को एक-एक करके निकालता रहे और अंदर से सच्चे शुक्र की भावना को विकसित करे। यही वह सकारात्मक सोच है, जो इंसान को सच्ची कृतज्ञता और अल्लाह की दी हुई नेमतों की क़दर करना सिखाती है।

BOOKS FOR UNDERSTANDING THE SPIRITUAL ESSENCE OF ISLAM

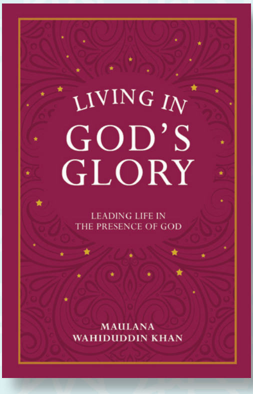

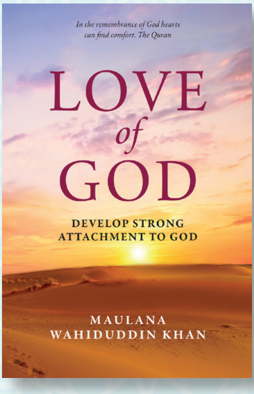

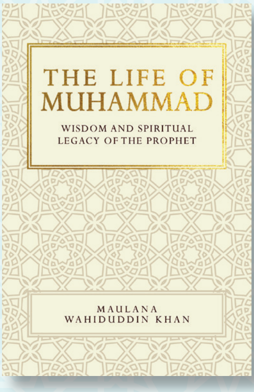

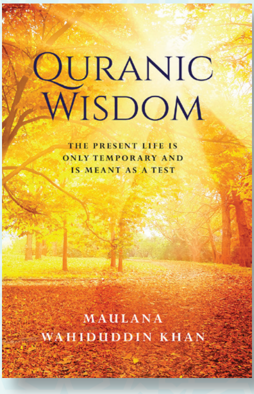

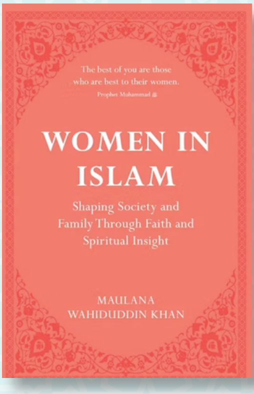

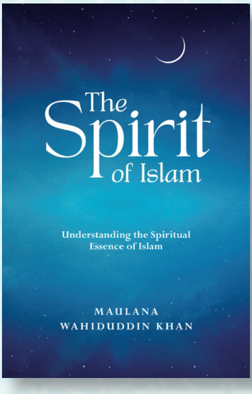

These books provide the general reader with an accurate and comprehensive picture of Islam– the true religion of submission to God.

To order call: 8588822675
sales@goodwordbooks.com

www.goodwordbooks.com

Date of Posting 10th and 11th of advance month
Published on the 1st of every month
Posted at NDPSO

Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2021-23
RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2021-23